سیرت رحمتِ عالم

(صلّی اللہ عَلَیہِ وَ اٰلِہٖ وَسَلَّمَ)

تالیف

اُستاذ الاساتذہ

پروفیسر عبدالقیومؒ

تحقیق و تخریج

حافظ محمد فیاض الیاس

کتاب: سیرتِ رحمتِ عالم (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم)

تالیف: پروفیسر عبدالقیوم رحمہ اللہ

ناشر: ریاض احمد چودھری

سیکرٹری/ڈائریکٹر بزمِ اقبال لاہور 0335-6347530

مطبع: ادبستان لاہور

اشاعت: مارچ ۲۰۲۱ء

تعداد: دو ہزار

قیمت: پانچ سو روپے

بزمِ اقبال، ۲ کلب روڈ لاہور 042-99200851

یہ کتاب محکمۂ اطلاعات و ثقافت و محکمہ خزانہ، حکومت پنجاب کے مالی تعاون سے شائع ہوئی ہے

فہرست

قدیم تہذیبوں کا تعارف

جزیرۂ عرب

پہلا باب

سیرت النبی ﷺ (ابتدائی حالات)

دوسرا باب

آنحضرت ﷺ کی بِعثت

تیسرا باب

مدینہ میں ورودِ مسعود

چوتھا باب

غزوات النبی ﷺ

غزوۂ بدر

غزوۂ اُحد

غزوۂ خندق

صُلح حُدَیبیہ

ہَم عصر حُکمرانوں کو تبلیغ اِسلام

غزوۂ خیبر

پانچواں باب:

فتح مکہ سے وفات تک

غزوۂ حُنَین

محاصرۂ طائف

غزوۂ تبوک

چھٹا باب:

اِسلامی تعلیمات

ساتواں باب:

ا۔ اَخلاقِ نبوی

۲۔ عہدِ نبوی میں نظامِ سلطنت

پیش لفظ

''سیرت رحمتِ عالم ﷺ'' سے موسوم یہ کتاب پروفیسر عبدالقیوم رحمہ اللہ کی تالیف ''تاریخ اسلام'' کا ایک حصہ ہے۔ پروفیسر صاحب مرحوم عربی و اسلامی علوم کے بہت بڑے عالم، محقق اور استاذ تھے۔ ان کی ساری زندگی دینی علوم کی خدمت میں گزری۔ انھوں نے سکول و کالج کے طلباء کے لیے اسے مرتب کیا، تاہم یہ عام قارئین کے لیے بھی بے حد مفید ہے۔ یہ کتاب کئی اعتبار سے سیرت کی دوسری کتابوں سے نمایاں ہے۔

۱۔ یہ خاص طور پر طلباء وطالبات اور عام پڑھے لکھے طبقے کے لیے لکھی گئی۔

۲۔ مؤلفِ کتاب عربی و اسلامی تحقیق میں بڑا ملکہ رکھتے تھے، اس لیے ان کی ہر کاوش بڑی مستند، معتبر اور معلومات افزا ہے۔

۳۔ اس کتاب میں واقعات کا تجزیہ وتحلیل اور اسباب وعلل کو نہایت خوبی کے ساتھ پیش کیا گیا۔

انھی خوبیوں کی وجہ سے اس کتاب کو تحقیق وتخریج اور خوب صورت طباعت کے ساتھ آپ کی خدمت میں پیش کیا جارہا ہے۔

ریاض احمد چودھری
سیکرٹری/ ڈائریکٹر
بزمِ اقبال، لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

گزارشِ احوال

(اشاعتِ اوّل)

یہ کتاب تاریخ اسلام کے طالب علموں کے لیے مرتب کی گئی ہے۔ کوشش کی گئی ہے کہ اس کتاب کو طلبہ کے لیے ہر لحاظ سے مکمل اور مفید بنایا جائے۔ مستند تاریخی معلومات درج کی گئی ہیں اور ہر جگہ طلبہ کی ضروریات اور معیار کا خیال رکھا گیا ہے۔

کتاب کی تیاری میں تمام قدیم و جدید کتب سے استفادہ کیا گیا ہے۔

چند ضروری نقشہ جات بھی شامل کر دیے گئے ہیں تاکہ واقعات کے سمجھنے میں طلبہ کو آسانی ہو۔

کتاب کی افادیت کو بڑھانے کے لیے تمام مشورے بصد شکریہ قبول کیے جائیں گے۔

مؤلف

قدیم تہذیبوں کا تعارف

تاریخِ اِسلام کا پسِ منظر، مشرقِ قریب میں قدیم تہذیبیں

دریاؤں کی وادیوں نے قدیم انسانی تہذیب کو جنم دیا، بالخصوص دریائے نیل، دِجلہ، فُرات اور سندھ کی وادیوں میں قدیم تہذیبیں پروان چڑھیں۔ اس کی زیادہ تر وجہ یہ تھی کہ ان وادیوں میں بسنے والے لوگ زیادہ ترقی یافتہ تھے۔ ان کی ترقی وتہذیب چند باتوں سے خاص طور پر ظاہر ہوتی ہے:

الف۔ انھوں نے مل جل کر رہنے کے لیے بستیاں بنائیں۔

ب۔ وہ لکھنا پڑھنا جانتے تھے اور تحریر کے ذریعے اپنے خیالات دوسروں تک پہنچا سکتے تھے۔

ج۔ وہ مل جل کر کام کرتے اور ایک دوسرے کی مدد اور اعانت کرتے تھے۔

د۔ وہ سوچ بچار کر کے اپنی مشکلات کا حل تلاش کرتے اور اَسرارِ قدرت کی ٹوہ میں لگے رہتے تھے۔

ھ۔ قدیم تہذیب کے مرکزی شہروں میں سے بعض تو پانچ ہزار سال بلکہ اس سے بھی پہلے موجود تھے۔

و۔ اہلِ بابل و نینوا، اشوری، یونانی، رومی اور ایرانی اپنی اپنی تہذیب کے لیے خاص طور پر مشہور ہیں۔

پرانے زمانے میں دِجلہ وفرات کی وادی بہت سرسبز وشاداب تھی۔ اس وادی کے جنوبی حصے میں سُمیری قوم آباد تھی۔ سُمیریوں نے بڑے بڑے شہر آباد کیے۔ یہ لوگ زراعت، تجارت اور صنعت وحرفت میں بڑے ماہر تھے۔ لکھنا پڑھنا بھی جانتے تھے۔ کھانے پینے کی چیزوں کی

اِفراط تھی۔ یہ لوگ تہذیب وتمدّن میں مشہور اور نامور ہوئے ہیں۔ البتہ اُنھوں نے جو شہر بسائے ان کو ایک دوسرے سے کوئی تعلق نہ تھا۔ ہر شہر الگ تھا۔ اس کے دیوتا الگ تھے۔ تیوہار الگ اور ہر شہر کا بڑا پروہت الگ۔ یہی بڑا پروہت شہر کا حاکم اور بادشاہ بھی تھا۔[1]

بابل ونینوا

پرانے زمانے میں بابل ایک چھوٹا سا گاؤں تھا جو دِجلہ وفُرات کی وادی میں واقع تھا اور آہستہ آہستہ ترقی کرکے ایک خوش حال اور بڑا شہر بن گیا۔

تقریباً چار ہزار برس پہلے کی بات ہے کہ شام کے علاقے سے ایک قوم نے آکر بابل پر قبضہ کرلیا۔ پھر آس پاس کے علاقوں کو فتح کرکے وادی کے اوپر کے حصے اور نچلے حصے پر بھی قابض ہوگئے۔ اب یہ ساری بستی بابل کی سلطنت کہلانے لگی۔

اہلِ بابل نے مفتوحہ علاقوں کے لوگوں سے بہت کچھ سیکھا۔ اُنھوں نے سُمیریوں کے خیالات اور ایجادوں سے بھی بڑا فائدہ اُٹھایا۔

اہلِ بابل کی تہذیب دُنیا کی قدیم تہذیبوں میں شمار ہوتی ہے۔ اُنھوں نے لکھنے کا طریقہ سمیریوں سے سیکھ کر اس میں کچھ کانٹ چھانٹ کی۔ کاغذ کی بجائے وہ مٹی کی تختیوں پر لکھتے تھے۔ اہلِ بابل نے بہت سے قانون تو سمیریوں سے لیے اور کچھ قانون نئے بنائے۔ بابلیوں نے باقاعدہ سلطنت کی بنیاد رکھی۔ تجارت اور لین دین کے نئے طریقے نکالے۔

اہلِ بابل کا مشہور بادشاہ حَمُورابی تھا۔ اس نے سلطنت کو منظم کرکے ایک ضابطۂ قانون تیار کیا۔ حمورابی کا دعویٰ تھا کہ یہ قانون اس پر انصاف کے دیوتا نے اتارا ہے۔ اس نے ان قوانین کو ایک ستون پر کندہ کرادیا تھا۔ اس مجموعۂ قوانین میں مختلف طبقات کے حقوق وفرائض کی وضاحت کی گئی تھی اور جرائم کی سزائیں مقرر کی گئی تھیں۔

اہلِ بابل نے فلکیات یعنی علم النجوم اور اجرامِ سماوی کا خوب مطالعہ کیا۔ وہ چاند اور

---

[1] اردو دائرۂ معارفِ اسلامیہ: ۹/ ۲۱۷، ۱۵/ ۲۱۷

سورج گرہن کا صحیح اندازہ لگا سکتے تھے۔ بابلیوں نے سال کو بارہ مہینوں میں تقسیم کر کے ہر ایک مہینے کا الگ نام رکھا اور سات دن کا ہفتہ مقرر کیا۔[1]

اشور (Assyrns)

بابلیوں کی آبادی بڑھ جانے کی وجہ سے لوگ شمال کی طرف بڑھنے شروع ہوئے اور ایک نئے شہر کا وجود عمل میں آیا۔ اس نئے شہر کو اُنھوں نے اپنے دیوتا کے نام پر اشور کہنا شروع کیا۔ اشوری لوگ پہلے تو اہل بابل کے ماتحت رہے لیکن جب اُنھوں نے جلی قوم سے لوہے کے ہتھیار بنانا سیکھ لیا تو وہ بڑے طاقتور بن گئے اور ایک مستقل حکومت قائم کر کے نینوا (Nineveh) کو صدر مقام بنا لیا، پھر آس پاس کے علاقوں پر قابض ہو گئے۔ اشوری بڑے وحشی اور خون خوار لوگ تھے۔ ۷۲۲ قبل مسیح میں اشوریوں نے اسرائیل کو فتح کر لیا لیکن بالآخر کلدانیوں (Chaldeans) اور ایرانیوں نے اشوریوں کو شکست دے کر نینوا پر قبضہ کر لیا۔[2]

کنعانی یا فَنیقی

تین ہزار برس پہلے کی بات ہے کہ بُحَیْرَہ روم کے مشرقی کنارے پر شام کے ساحل کے ساتھ ساتھ کنعان (Canaan) یا فنیقہ (Phoenicia) آباد تھا۔ اس علاقے کے باشندے کنعانی یا فَنیقی کہلاتے تھے۔ یہ لوگ مچھلیاں پکڑتے، جہاز اور کشتیاں چلاتے اور خوب تجارت کرتے تھے۔ فَنیقی تاجر اپنا مال لے کر دُور دُور تک تجارت کے لیے جاتے اور وہاں کی تہذیب اپنے وطن میں لاتے تھے۔[3]

---

[1] اليعقوبي، تاريخ :١/١١٣، القزويني، آثار البلاد، ص:٣٠٤، الموسوعة العربية الميسرة: ٢/٥٧٧_٥٧٨، البكري، معجم ما استعجم :١/٢١٨، البروسوي ، أوضح المسالك، ص: ١٨٧

[2] الموسوعة العربية الميسرة :١/٣١٦

[3] ياقوت الحموي ، معجم البلدان :٤/٤٨٣ ، جواد علي ، المفصل :٨/١١٧، الموسوعة العربية الميسرة :٥/٢٥١٦

فنیقیوں نے بہت سے ہنر دوسرے ملکوں سے سیکھے، لیکن رومیوں نے ان سے بہت کچھ سیکھا، خاص طور پر لکھنے کا طریقہ۔ فنیقیوں کا لکھنے کا طریقہ بابلیوں اور مصریوں سے آسان تھا۔ ان کے ہاں صرف بائیس حروف ابجد تھے۔ یونانیوں نے ان سے لکھنے کا طریقہ سیکھ کر سارے یورپ کو سکھایا۔ فنیقیوں نے اپنی تجارت کو فروغ دینے کے لیے جا بجا بستیاں قائم کیں۔ ان میں قرطاجنہ (کارتھیج) نے بڑی شہرت پائی۔[1]

عِبرانی

عبرانی قوم کی ابتدا حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ہوتی ہے جو عراق کی سرزمین کو خیر باد کہہ کر کنعان یا فنیقہ میں جا آباد ہوئے۔[2] حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بت پرستی کے خلاف جہاد کیا اور توحید کی تبلیغ کی۔[3]

بنی اسرائیل

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دو بیٹے تھے: حضرت اسحاق علیہ السلام اور حضرت اسمٰعیل علیہ السلام۔[4] حضرت اسحاق علیہ السلام کے بیٹے حضرت یعقوب علیہ السلام کا لقب اسرائیل تھا۔ چنانچہ ان کی اولاد بنی اسرائیل مشہور ہوئی۔[5] جس کا ذکر قرآنِ مجید میں بھی ہے۔[6] قحط کی وجہ سے اسرائیلی لوگ مصر میں جا بسے۔ جب فرعون کا ظلم حد سے بڑھ گیا تو اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بھیج کر بنی اسرائیل کو نجات دلائی۔ فرعون اور اس کے لشکر کو سمندر میں غرق کر دیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام

---

1. الموسوعة العربية الميسرة: ۲۰۱۷/۵
2. الموسوعة العربية الميسرة: ۲۲۱۷/۴، جواد علي، المفصل: ۴۹۵/۱
3. مريم: ۱۹/ ۴۱-۵۰، الأنعام: ۶/ ۷۴-۸۱، الأنبياء: ۲۱/ ۵۱-۷۱، جواد علي، المفصل: ۴۹۵/۱
4. البقرة: ۲/ ۱۲۵-۱۲۷-۱۳۳-۱۳۶-۱۴۰، الصافات: ۳۷/ ۱۱۲
5. الموسوعة العربية الميسرة: ۷۸۸/۲
6. البقرة: ۲/ ۴۰-۴۷

کے ذریعے بنی اسرائیل کو مقدس کتاب تورات ملی اور موسوی شریعت عطا ہوئی۔[1] اس شریعت کی بنیاد دس احکام پر ہے۔[2]

بعدازاں بنی اسرائیل نے کنعان فتح کر کے وہاں اپنی حکومت قائم کی۔ ان میں حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہ السلام نے پیغمبر اور بادشاہ کی حیثیت سے بڑا نام پایا۔[3] حضرت سلیمان علیہ السلام نے بیت المقدس میں عالی شان محل بنائے اور ایک عظیم الشان عبادت گاہ تعمیر کی۔[4]

یہودی

حضرت سلیمان علیہ السلام کے بعد بنی اسرائیل کمزور ہو گئے، سلطنت تقسیم ہوگئی اور بیت المقدس کی حکومت کے حامی صرف یہود اور ابن یمین کے قبیلے رہ گئے۔ یہی لوگ بعد میں یہودی کہلائے۔ یہودی مذہب میں بڑا غلو اور سختی کرنے لگے۔ ۵۸۶ قبل مسیح میں بابلیوں کے بادشاہ بخت نصر نے یہودیوں پر حملہ کر کے بہت سے یہودی تہ تیغ کر دیے اور بہت سے قیدی بنا لیے۔ بعد میں رومیوں نے یہودیوں کو زیر نگیں بنا لیا، مگر جب یہود نے بغاوت کی تو رومی حکمرانوں نے بیت المقدس کو تباہ کر دیا اور یہود کا قتل عام کیا۔[5]

قدیم یونانی قوم

یونان کا علاقہ بحیرۂ روم کے کنارے واقع ہے۔ قدیم زمانے میں یونان بہت سی چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بٹا ہوا تھا۔ ہر ریاست خودمختار تھی۔ ان ریاستوں میں سپارٹا اور ایتھنز کی

---

[1] البقرة: ٢/ ٤٩، الأعراف: ٧/ ١٤١، يونس: ١٠/ ٩٠

[2] ضياء الرحمن الأعظمي، دراسات في اليهودية والمسيحية، ص: ١٨٦، سعود بن عبدالعزيز الخلف، دراسات في الأديان اليهودية والنصرانية، ص: ٧٦

[3] البقرة: ٢/ ٢٥١، النساء: ٤/ ١٦٣، الأنعام: ٦/ ٨٤، الأنبياء: ٢١/ ٧٨

[4] سبا: ٣٤/ ١٣، النمل: ٢٧/ ٤٤

[5] الموسوعة العربية الميسرة: ٧/ ٣٦٥٥، موسوعة الأديان لمجموعة من العلماء، ص: ٥٠٤، إسلام محمود دربالة، موسوعة الفرق والأديان، ص: ٤٣٦، ياقوت الحموي، معجم البلدان: ٥/ ٤٥٣

ریاستیں زیادہ مشہور تھیں۔ دونوں کے نظامِ حکومت اور قانون میں بڑا فرق تھا۔ یونانیوں کا طرزِ حکومت جمہوری تھا۔ سیاست میں اُنھوں نے فرد کے حقوق کو تسلیم کیا اور شہریوں کو نظم و نسق میں شریک کیا۔ سپارٹا کے باشندے شمشیر وسنان کے دَھنی تھے۔ ان کا نظامِ حکومت فوجی انداز کا تھا۔ وہ سخت کوش، جفاکش اور بہادر تھے۔ ان کی گھریلو زندگی بھی اسی قسم کی تھی۔ اس کے مقابل ایتھنز کے لوگ جمہوریت پسند تھے۔ ان کے ہاں تعلیم و تربیت کے لیے اعلیٰ قسم کے سکول موجود تھے۔ وہ جسمانی صحت اور طاقت کے ساتھ ساتھ قوم کی دماغی اور ذہنی نشو و نما کا بھی پورا خیال رکھتے تھے۔ ورزش بھی کرتے اور علوم وفنون میں بھی نمایاں حصہ لیتے تھے۔

یونانیوں نے علم و ادب میں بڑی شہرت حاصل کی۔ بالخصوص فنونِ لطیفہ اور فنِ تعمیر، فلسفہ و طب، ریاضی وعلم ہیئت، اَدَب، تاریخ نگاری اور ڈراما نویسی میں بڑا نام پیدا کیا۔ رزمیہ اور عشقیہ شاعری میں بڑی ترقی کی۔ سُقراط[1]، افلاطون[2] اور اَرِسطو[3] جیسے مشہور فلسفی، بُقراط[4] اور جالینوس[5] جیسے نامور طبیب سرزمین یونان میں پیدا ہوئے۔[6] ارشمیدس[7] مشہور ریاضی دان اور علم ہیئت کا ماہر تھا۔ اُقلیدس[8] نے علم ہندسہ میں نام پایا۔[9]

---

[1] Socrates، ٤٧٠ تا ٣٣٩ ق م، ایتھنز کا مشہور فلسفی اور معلم

[2] Plato، ٤٢٧ تا ٣٤٧ ق م، مشہور یونانی فلسفی، Republic کا مصنف

[3] Aristotle، ٣٨٤ تا ٣٢٢ ق م، مشہور یونانی فلسفی، افلاطون کا شاگرد اور سکندر اعظم کا استاد۔ اس کی منطق، مابعد الطبیعیات، اخلاقیات، سیاسیات وغیرہ پر معروف تصانیف ہیں۔

[4] Hippocrates، ٤٦٠ تا ٣٧٧ ق م، یونانی طبیب جسے طب کا باوا آدم کہا جاتا ہے۔

[5] Galen، ١٣٠ تا ٢٠٠ء (تخمیناً)، یونانی طبیب، فلسفہ اور طب پر کتابیں لکھیں۔

[6] الموسوعة العربية الميسرة :٣٦٧٥/٧-٣٦٧٩ ، القزويني ، آثار البلاد، ص: ٥٦٩

[7] Archimedes، ٢٨٧ تا ٢١٢ ق م، یونانی ریاضی دان اور صاحبِ ایجادات، جو سسلی میں پیدا ہوا تھا۔

[8] Euclid ، تیسری صدی قبل مسیح کا یونانی ریاضی دان، جیومیٹری پر بنیادی کتاب کا مصنف، جو اسی کے نام اقلیدس سے موسوم ہوئی۔

[9] ابن أبي أصيبعة ، عيون الأنباء ، ص: ٣٢-٩٣، الصفدي ، الوافي :١٥٢/٨، الشهرستاني، الملل والنحل :٦١/٢-٨٣-١٠٩

مسلمانوں نے یونانی علوم وفنون کو عربی زبان میں [illegible] سے بھر لینے کے علاوہ قدیم یونانی علوم کو ہمیشہ کے لیے محفوظ [illegible]

یونانی فاتح سکندر اعظم نے متمدن دنیا کے ایک [illegible] بعد یونانی سلطنت کا زوال شروع ہو گیا۔[1]

قدیم رومی قوم

ہزاروں سال ہوئے کہ رومی لوگ اٹلی پر قبضہ کر کے وہاں آباد ہو گئے۔ مختلف [illegible] پر بستیاں بنالیں۔ ان میں سے ایک قبیلہ لاطینی کے نام سے مشہور تھا۔ اس قبیلے نے [illegible] کے کنارے روم (Rome) یا رومہ کے نام سے ایک شہر آباد کیا اور اسی شہر کی نسبت سے [illegible] رومی مشہور ہوئے۔

رومی بڑے تنومند، محنتی اور جفاکش تھے۔ وہ اعلیٰ درجے کے سپاہی اور سیاستدان ثابت ہوئے۔ اُنھوں نے اپنی جنگی مہارت کی وجہ سے آس پاس کے علاقوں کو فتح کر کے اپنی سلطنت میں شامل کر لیا تھا۔ متمدن دنیا کے مغربی حصے ان کے زیرنگیں تھے۔ رومی حکمران طاقتور بھی تھے اور اچھے حاکم بھی۔ رومیوں نے عدل وانصاف کے بعض بنیادی اُصول وضع کیے۔ ان کا یہ مجموعۂ قانون عام طور پر قابلِ قبول سمجھا گیا۔ ابتدا میں رومی حکومت میں جمہوری اور شورائی نظام کارفرما تھا۔ ایک مجلس شوریٰ تھی جس میں سب شہروں کے نمائندے شامل ہوتے تھے لیکن آخر کار شہنشاہیت غالب آ گئی۔ ان کا پہلا شہنشاہ آگسٹس (Augustan ۲۷ق م تا ۱۴ء)[3] تھا۔

رومی بادشاہوں کا عام لقب قیصر (Caesar) تھا۔[3]

---

[1] ابن أبي أصيبعة، عيون الأنباء، ص: ٢٥٦

[2] جواد علي، المفصل ٥/٢:

[3] جواد علي، المفصل ٣١/٢:، الموسوعة العربية الميسرة ٦٨٨/٣:، ابن الأثير، الكامل: ٣٢٢/١۔ فارس کے بادشاہ کو کسریٰ، یمن کے بادشاہ کو تبع، حبشہ کے بادشاہ کو نجاشی، ہند کے بادشاہ کو بطلیموس، مصر کے بادشاہ کو فرعون، اسکندریہ کے بادشاہ کو مقوقس، فرغانہ کے بادشاہ کو اِخشید،،،،،

عیسائیت کا ظہور

آگسٹس کے عہد حکومت میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام پیدا ہوئے اور اس وقت فلسطین رومیوں کے ماتحت تھا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے یہودیوں کی اصلاح کے لیے اَن تھک کوششیں کیں لیکن یہودیوں نے ان کی ایک بات بھی نہ مانی، اُلٹا ان کے دُشمن ہو گئے۔ حضرت مسیح علیہ السلام نے اپنا عہد جوانی ناصرہ شہر میں گزارا تھا، اس لیے انھیں مسیح ناصری کہتے تھے اور ان کے ماننے والوں کو نصرانی۔ نصرانیوں کو عیسائی اور مسیحی بھی کہتے ہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد ان کا دین پھیلنے لگا اور آہستہ آہستہ اٹلی میں جا پہنچا اور شاہ قسطنطین[1] (قیصرِ روم) نے عیسائی مذہب قبول کر لیا۔ پھر رومی حکومت کی بدولت عیسائیت کو بڑی قوت اور عظمت حاصل ہو گئی اور عیسائیت بہت سے ملکوں میں پھیل گئی۔[2]

بزنطینی (Byzantine) حکومت

شاہ قسطنطین نے ۳۳۰ء میں رومہ کو چھوڑ کر شہر بزنطیم (Byzantine) کو اپنا دارالحکومت بنایا۔ اس وقت سے بادشاہ کے نام پر اس شہر کا نام قسطنطنیہ مشہور ہو گیا[3] اور قسطنطنیہ کے قدیم نام بزنطیم کی وجہ سے مشرقی حصۂ سلطنت کو بزنطینی سلطنت (Byzantine empire) کہتے ہیں۔ چوتھی صدی کے آخر تک مسیحیت رومی سلطنت میں پھیل چکی تھی۔ مذہب کو بنیادی حیثیت حاصل ہو گئی۔ اَدب، شاعری اور فنونِ لطیفہ مذہب کے تابع تھے۔ رومی یہ بھی مانتے

>>>>> اُشرُ وسنہ کے بادشاہ کو اُفشین، خُوارزم کے بادشاہ کو خُوارزم شاہ، جرجان کے بادشاہ کو صُول، آذر بائیجان کے بادشاہ کو اُصبہذ اور طبرستان کے بادشاہ کو رسلان کہا جاتا تھا، البداية والنهاية: ۱۶۹/۱۱-۱۷۰

[1] Constantine: ۲۸۰ تا ۳۳۷ء، دورِ حکومت: ۳۰۶ تا ۳۳۷ء

[2] الشهر ستانی، الملل والنحل: ۲۲۰/۱، الموسوعة العربية الميسرة: ۳۳۸۴/۷-۳۶۴۴-۳۶۴۶، تفصیل کے لیے دیکھیے: رحمۃ اللہ بن خلیل الرحمٰن کیرانوی کی کتاب، اظہار الحق۔

[3] ياقوت الحموي، معجم البلدان: ۹۸/۳

تھے کہ ان کے بادشاہوں کو حکمرانی کا منصب خدا نے عطا کیا تا کہ وہ عوام کو فائدہ پہنچائیں۔ رومیوں پر یونانی اثر غالب تھا۔ رومی تجارت کرتے تھے۔ اُنھوں نے بڑے بڑے شہر بسائے۔ عمارتوں کا بہت شوق تھا۔ کھیل تماشے اور رتھوں کی دوڑ کے علاوہ کتابیں پڑھنے کا بھی شوق رکھتے تھے۔ بزنطینی حکومت تقریباً ایک ہزار برس (۳۹۵۔۱۴۵۳ء) تک قائم رہی۔ رومی سلطنت کی عظمت و شوکت شاہ جستنین (Justinian ۵۶۵ء) پر ختم ہوگئی۔ اس وقت ان کی سرکاری زبان لاطینی (Latin) تھی اور ان کا مجموعہ قوانین بھی لاطینی زبان میں مرتب ہوا تھا۔ بزنطینی حکومت پندرھویں صدی عیسوی کے وسط (۱۴۵۳ء) تک قائم رہی۔ عہدِ نبوی میں مصر اور شام کے علاقے بزنطینی سلطنت کے ماتحت تھے۔ خلافت راشدہ میں شام، فلسطین اور مصر مسلمانوں نے فتح کر لیے۔ عثمانی سلطنت کے مشہور حکمران سلطان محمد فاتح نے ۱۴۵۳ء میں قسطنطنیہ پر حملہ کر کے فتح کر لیا۔ اس وقت سے آج تک یہ شہر ترکوں کے قبضے میں چلا آتا ہے۔ اس کو آج کل استنبول کہتے ہیں۔[1]

ساسانی سلطنت

ایران ہزاروں سال پرانا ملک ہے۔ یہاں کئی خاندانوں نے حکومت کی۔ ایران میں بڑے نامور بادشاہ ہو گزرے ہیں جن میں سائرس، دارا اور نوشیروان عادل خاص طور پر مشہور ہیں۔[2] ۲۲۶ء میں اَرْدشیر اول نے ساسانی سلطنت قائم کی۔ ساسانیوں اور رومیوں کے درمیان چار سو برس تک لڑائیاں ہوتی رہیں۔ آخر کار مسلمانوں نے ۶۵۱ء میں ایران کو فتح کر لیا۔ خسرو دوم کے عہد میں ساسانی سلطنت نے بڑا عروج حاصل کیا۔ نوشیروانِ عادل اسی خاندان کا ایک مشہور اور دانشمند بادشاہ گزرا ہے۔ جب حضرت محمد ﷺ پیدا ہوئے تو ایران پر نوشیروان عادل حکمران تھا۔ ساسانیوں نے ملکی انتظام کے لیے عمدہ اور اعلیٰ قسم کے اُصول بنائے تھے۔ اس عہد میں

---

[1] الموسوعة العربية الميسرة: ٢٠٥٧/٥، البروسوي، أوضح المسالك، ص: ٥١٤۔٥١٩، القزويني، آثار البلاد، ص: ٦٠٣، جواد علي، المفصل: ٤٨٧/٢۔٥١٣

[2] ابن الأثير، الكامل: ٤٣٤/١

ایران تہذیب وتمدن میں دنیا کے اکثر ممالک سے آگے تھا۔ ساسانی خاندان کے بادشاہ کسریٰ کہلاتے تھے۔ وہ مطلق العنان فرماں روا تھے۔ ان کو شکار اور عمارتوں کا بڑا شوق تھا۔[1]

ایرانی لوگوں کو مصوری، بت تراشی اور نفیس کپڑا بُننے میں بڑی مہارت تھی۔ نقش و نگار کے لیے بھی ایرانی مشہور تھے۔[2]

زرتُشتی

ایران کے قدیم لوگ زرتُشت کے پیرو تھے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ اس کا زمانہ حضرت مسیح علیہ السلام سے چھ سات سو برس پیشتر تھا۔ زرتُشت کے نزدیک دنیا میں نیکی اور بدی کے درمیان ہمیشہ جنگ رہتی ہے۔ نیکی کا دیوتا یزدان ہے اور بدی کا اَہرمَن۔ اس نے لوگوں کو نیکی کی دعوت دی۔ زرتُشت کے پیرو زرتشتی کہلاتے ہیں۔ وہ آگ کو مقدس مانتے ہیں اور ان کے عبادت خانوں میں آگ روشن رکھی جاتی ہے اس لیے ان کے معبد کو آتش کدہ کہتے ہیں۔ زرتُشتیوں کو عرب مجوس کہتے ہیں۔ عام لوگ اُنھیں آتش پرست کہتے ہیں۔ پاکستان میں وہ پارسی کہلاتے ہیں۔

اردشیر اول نے زرتشتی مذہب کو سلطنت کا مذہب قرار دے کر بڑا رواج دیا۔ اس کے عہد میں مُوبد یعنی مذہبی پیشوا مذہبی اور سیاسی معاملات میں بڑا دخل رکھتے تھے۔ جب مسلمانوں نے ایران کو فتح کرلیا تو یہ مذہب آہستہ آہستہ ختم ہوگیا۔ البتہ بعض زرتشتی برصغیر پاک و ہند میں چلے آئے اور پارس (فارس) یعنی ایران سے آنے کی وجہ سے پارسی کہلائے۔[3]

یہ مختصر سا تعارف ہے ان تہذیبوں کا جو اسلام سے پہلے دنیا میں موجود تھیں اور جن کی اکثریت سے اسلام کو سابقہ پڑا اور بالآخر اسلام ان سب پر غالب آیا۔

---

[1] الموسوعة العربية الميسرة :١٧٧٢/٤ ، جواد علي ، المفصل :٢/٤٨٧_٥١٣، ابن الأثير، الكامل :١/٣٧٩، تاريخ أبي الفداء :١/٨١_٨٨، المسعودي ، مروج الذهب :١/٢٥١

[2] الموسوعة العربية الميسرة :١/٥٤٦، جواد علي ، المفصل :٨/٥٣

[3] الشهرستاني ، الملل والنحل :١/٢٣٦ ، موسوعة الأديان ،ص: ٢٧٩، الموسوعة العربية الميسرة :٦/٣٠٣١ ،اُردو دائرہ معارف اسلامیہ:۵/۳۴۹

جزیرۂ عرب

جغرافیائی، مذہبی، سیاسی اور معاشرتی حالات

جزیرۂ عرب

عرب کا ملک ایک جزیرہ نما ہے۔اس کے تین طرف پانی ہے، یعنی مشرق میں خلیج فارس، جنوب میں بحیرۂ عرب، مغرب میں بحیرۂ احمر (یا بحیرۂ قلزم) شمال میں عراق اور شام کے ملک ہیں، لیکن عرب اپنے ملک کو جزیرۂ عرب کہتے ہیں۔

جزیرۂ عرب پاکستان کے مغرب میں واقع ہے۔ اس کا اکثر حصہ ریگستان اور پہاڑ ہے۔ پہاڑوں کی بعض چوٹیاں دس ہزار فٹ تک بلند ہیں۔ ملک کا درمیانی حصہ خشک ہونے کی وجہ سے بنجر اور غیر آباد ہے، البتہ اس کے کنارے اور ساحلی علاقے سرسبز اور شاداب ہیں اور انھی علاقوں میں اکثر لوگ آباد ہیں۔

جزیرۂ عرب کا رقبہ دس لاکھ مربع میل ہے۔ حجاز، یمن، حضرموت، عُمان، اَحساء اور نجد اس کے مشہور صوبے ہیں۔ حجاز کا صوبہ سب سے زیادہ مشہور ہے کیونکہ اسی صوبے میں حضرت رسولِ اکرم ﷺ تشریف لائے تھے۔ یہ صوبہ جزیرۂ عرب کے شمال مغرب میں بحیرۂ احمر کے ساتھ ساتھ پھیلا ہوا ہے۔ اس صوبے میں دو بندرگاہیں ہیں: جدّہ اور ینبُع۔ حجاز کے مشہور شہروں میں مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ اور طائف خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔[1]

مکہ مکرمہ میں بیت اللہ شریف ہے جو مسلمانوں کا قبلہ ہے۔ صاحبِ توفیق مسلمان ہر سال لاکھوں کی تعداد میں حج بیت اللہ کے لیے یہاں آتے ہیں۔ ہمارے رسول

---

[1] ياقوت الحموي، معجم البلدان: ٢/١٣٧، جواد علي، المفصل: ١/١١٠، البروسوي، أوضح المسالك، ص: ٢٧٢_٤٤٧_٥٨١_٦٠١

حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ یہیں پیدا ہوئے تھے۔[1] شہر مکہ کے چاروں طرف بلند اور دشوار گزار پہاڑ ہیں۔ شہر کا شمالی حصہ اونچائی پر ہے اور جنوب کا پستی میں۔[2] مکہ کو بکّہ بھی کہتے تھے۔[3]

مدینہ منورہ کا اصلی نام یثرِب تھا۔[4] یہ شہر مکہ کے شمال میں تقریباً ۲۷۰ میل (۴۴۰ کلومیٹر) کے فاصلے پر واقع ہے۔ اُحُد پہاڑ مدینہ کے شمال میں ہے۔[5] حضرت رسولِ اکرم ﷺ نے ہجرت کے بعد اسی شہر میں سکونت اختیار فرمائی۔ آپ ﷺ کی مسجد اور روضۂ مبارکہ اسی شہر میں ہیں۔

طائف کا شہر اپنے باغات اور شادابی کی وجہ سے مشہور ہے۔ یہ شہر مکے سے جنوب مشرق کی طرف تقریباً ۵۵ میل (۹۰ کلومیٹر) کے فاصلے پر واقع ہے۔ سمندر سے پانچ ہزار فٹ بلند ہونے کی وجہ سے اس کی آب و ہوا معتدل اور خوشگوار ہے۔ چشموں کی وجہ سے یہاں پانی عام ہے، اس لیے پھل اور سبزیاں بہت ہوتی ہیں۔ طائف کو حجاز کا صحت افزا مقام کہنا بے جا نہ ہوگا۔ طائف اور مکے میں تجارتی روابط تھے۔ اہلِ مکہ میں سے دولت مند لوگوں نے طائف میں باغات خرید رکھے تھے۔[6]

حجاز کے جنوب میں یمن کا صوبہ ہے۔ یمن بُحیرۂ احمر کے کنارے عدن تک پھیلا ہوا ہے۔ زیادہ تر پہاڑی علاقہ ہونے کی وجہ سے جزیرۂ عرب میں سب سے زیادہ زرخیز اور سرسبز صوبہ ہے۔ یہاں کے مُلوکِ یمن شہرۂ آفاق تھے۔ قدیم زمانے میں ان کی تجارت

---

[1] ابن الأثير، الكامل: ۱/۴۵۸

[2] ياقوت الحموي، معجم البلدان: ۲/۱۳۷

[3] آل عمران: ۳/۹۶

[4] الأحزاب: ۳۳/۱۳

[5] الموسوعة العربية الميسرة: ۱/۱۱۱

[6] البروسوي، أوضح المسالك، ص: ۴۴۷

ممالک مشرقِ ادنیٰ اور ہند و پاک سے قائم تھی۔[1]

حضرموت ، عُمان اور اَحساء بھی ساحل سمندر کے ساتھ ساتھ آباد ہیں، البتہ نجد جزیرۂ عرب کے وسط میں واقع ہے۔ سطح مرتفع ہونے کے سبب زرخیز اور شاداب علاقہ ہے۔[2]

عرب میں دو مشہور صحرا ہیں: شمال میں بادیۂ سماوہ یا نُفود ہے جو ۱۸۰ میل لمبا، ۱۴۰ میل چوڑا ہے[3] اور جنوب میں رُبع خالی ہے۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ اس کا رقبہ پچاس ہزار مربع میل ہے۔ یہاں پانی اور سبزہ محض نام کا ہوتا ہے۔[4]

آب و ہوا اور پیداوار

جزیرۂ عرب کی آب و ہوا گرم خشک ہے۔ بارش بہت کم ہوتی ہے۔ دن کے وقت سخت گرمی پڑتی ہے اور شدت کی گرمی میں بادِ سموم چلتی ہے۔

یہاں کا مشہور پھل کھجور ہے۔ کہیں کہیں باجرہ ، جَو اور گیہوں بھی پیدا ہوتے ہیں۔[5]

طائف کے پھلوں میں انار اور انگور بہت مشہور اور لذیذ ہیں۔[6]

عربوں کے پالتو جانوروں میں گھوڑا ، اونٹ اور بھیڑ بکری زیادہ مشہور ہیں، لیکن اونٹ

---

[1] البروسوي، أوضح المسالك ، ص: ٦٥٥، البكري، معجم ما استعجم: ١٤٠١/٢ ، ياقوت الحموي، معجم البلدان: ٤٤٧/٥

[2] البروسوي، أوضح المسالك ،ص: ٦٢١ ، ياقوت الحموي ، معجم البلدان: ٢٦٢/٥، البكري، معجم ما استعجم: ١٢٩٨/٢

[3] ياقوت الحموي، معجم البلدان: ٢٤٥/٣، البروسوي ، أوضح المسالك، ص: ٣٩٢، البكري، معجم ما استعجم: ٧٥٤/٢

[4] جواد علي ، المفصل: ١١٨/١

[5] جوادعلي، المفصل: ١٦٨/١

[6] البروسوي، أوضح المسالك، ص: ٤٤٨

بہت اہمیت رکھتا ہے۔ اس پر سوار ہو کر عرب بے آب و گیاہ صحراؤں کو طے کرتے تھے۔ اونٹوں کا گوشت کھاتے اور دودھ پیتے تھے۔ تجارتی مال بھی اونٹ پر لاد کر ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاتے تھے۔[1]

باشندے

جزیرۂ عرب کے باشندے دو طرح کے ہیں:

۱۔ شہروں اور گاؤں میں رہنے والے حضری کہلاتے ہیں۔ حضری لوگ عام طور پر تجارت، کھیتی باڑی یا صنعت و حرفت کے ذریعے پیٹ پالتے ہیں۔

۲۔ صحرا اور بادیہ میں رہنے والے بدوی کہلاتے ہیں۔ یہ لوگ اونٹ اور بھیڑ بکریاں پال کر گزارہ کرتے ہیں۔ بدو لوگ کھانے پینے کی چیزوں کے لیے اِدھر اُدھر پھرتے رہتے ہیں۔ جہاں کھانے پینے کی چیزیں مل گئیں وہاں خیمے لگا لیے اور جب ختم ہو گئیں تو دوسری جگہ چل دیے۔[2]

ماہرین نسب نے عربوں کو دو گروہوں یعنی شمالی عربوں اور جنوبی عربوں میں تقسیم کیا ہے۔ نیز کہا جاتا ہے کہ شمالی عرب حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی اولاد ہیں اور عدنانی کہلاتے ہیں اور جنوبی عرب قحطانی کہلاتے ہیں۔ پھر عدنانیوں کی دو شاخیں بتائی گئی ہیں: رَبیعہ اور مُضَر۔ یہ سب چھوٹے بڑے قبائل ایک دوسرے سے برسرِ پیکار رہتے تھے۔[3]

خوراک کی قلت اور اقتصادی زبوں حالی کی وجہ سے عربوں میں جنگ و جدال کی عادت پیدا ہو گئی تھی۔ بدو عرب بڑے سادہ مزاج تھے۔ صنعت و حرفت، زراعت اور تجارت سے نفرت کرتے تھے۔ جانوروں کو پال کر انھی کا دودھ پیتے اور گوشت کھاتے۔ قحط کے

[1] جواد علي، المفصل: ١/١٥٦

[2] جوّاد علي، المفصل: ٤/٢١٣-٢٢٤

[3] جواد علي، المفصل: ٨/٥١٣

زمانے میں سوسمار بھی کھا لیتے تھے۔[۱]

عرب کے رہنے والے مختلف خاندانوں اور قبائل میں منقسم تھے۔ ہر قبیلے کا اپنا سردار ہوتا تھا۔ قبیلے کے سب افراد اپنے سردار کا حکم مانتے تھے۔ قبائلی زندگی نے عربوں میں خاندانی اتحاد اور یکجہتی پیدا کر دی تھی۔ خون اور نسب اتفاق اور اتحاد کا بڑا ذریعہ تھا۔ ہر شخص کا فرض ہوتا تھا کہ اپنے خاندان اور قبیلے کی عزت و ناموس کی حفاظت کرے۔[۲]

قبیلے کا سردار شیخ کہلاتا تھا۔ اس کی رائے قابلِ قدر اور قطعی سمجھی جاتی تھی۔ بعض اوقات سردار قبیلہ کو بھی عوام کے سامنے جھکنا پڑتا تھا۔ قبیلے کا سردار امن کے زمانے میں اپنے علاقے کا بادشاہ ہوتا تھا اور جنگ کے زمانے میں سپہ سالار۔ تلوار، نیزہ اور تیر عربوں کے مشہور ہتھیار تھے۔[۳]

عربی زبان

عربی زبان دنیا کی قدیم ترین زبانوں میں شمار ہوتی ہے۔ عربوں کو اپنی زبان کی فصاحت و بلاغت پر اتنا ناز تھا کہ وہ اس کے مقابلے پر تمام دنیا کو عجمی یعنی بے زبان اور گونگا سمجھتے تھے۔ عربی زبان میں ایک ایک چیز کے لیے بہت سے الفاظ اور نام ہیں۔ نیز ایک ہی لفظ کئی معنوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اس وجہ سے زبان بہت وسیع ہے۔ دوسری زبانوں کے مقابلے پر اس کے صیغے بھی چودہ ہیں۔ واحد، تثنیہ اور جمع، حاضر، غائب اور متکلم، مذکر اور مؤنث سب کے لیے الگ الگ الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔ پھر ایک ہی لفظ میں تھوڑی سی تبدیلی یا اضافے سے معنے بدل جاتے ہیں۔ اس طرح عربی زبان

---

[۱] جواد علي، المفصل :٤/٢٣٨-٤٦٨، الألوسي، بلوغ الأرب :٣/٣٤٦، أبو علي القالي، الأمالي:١/٤

[۲] جواد علي، المفصل:١/٢٨٠، الألوسي، بلوغ الأرب :٣/٣٤٦-٢٥٤

[۳] الألوسي، بلوغ الأرب :٢/٥٣، جواد علي، المفصل :٤/٢٥٥

میں الفاظ کا ذخیرہ بہت زیادہ ہو گیا ہے۔[1]

اظہارِ خیال کے لیے نثر و نظم دونوں کا استعمال عام تھا۔ نثر میں عربوں کی ضرب الامثال، محاورے اور خطبات اب تک یادگار ہیں۔ عربوں کے خطیب اپنی فصاحت و بلاغت، جادو بیانی اور سحر طرازی سے بڑی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔[2]

شعر و شاعری

شعر و شاعری عربوں کی گھٹی میں تھی۔ شاید ہی کوئی ایسا شخص نظر آئے جو شعر گوئی کا ذوق نہ رکھتا ہو یا جسے شعر و شاعری سے شغف نہ ہو۔ عربوں کے نزدیک شاعر اپنے قبیلے کی عزت و ناموس کا محافظ و نگران ہوتا تھا۔ شاعر اپنا اور اپنے خاندان کا نسب شعروں کے ذریعے محفوظ کر لیتا تھا۔ وہ اپنے خاندان کے جنگی کارناموں کو شاعری کے ذریعے دوام بخشتا اور اپنی قوم کی بہادری، مہمان نوازی، سخاوت اور دوسری خاندانی خوبیوں کا ذکر کر کے اپنے قبیلے کے نام کو روشن کرتا۔ میدانِ جنگ میں اپنی آتش بیانی اور شعلہ مقالی سے فوج کی ہمت بڑھاتا اور گزشتہ فتوحات کا ذکر کر کے قتل و غارت گری پر اُکساتا تھا۔

عربی زبان میں تمام اَصناف شعر موجود ہیں۔ شاعر مدح بھی کرتے تھے اور ہجو بھی۔ ان کے ہاں عشق و محبت کے جذبات کی بھی کچھ کمی نہیں۔ وہ مناظرِ قدرت کی تصویر بھی پیش کرتے۔ ذاتی کارناموں اور قبائلی مہموں کو بھی اشعار میں محفوظ کر لیتے اور اپنے قبیلے کی تاریخ بھی شعروں میں بیان کرتے تھے۔ عربی شاعری میں استعارہ اور تشبیہ عام استعمال ہوتی ہے۔[3]

عربوں کی شاعری حقیقت نگاری کا مرقع ہے۔ ان کے ہاں مبالغہ، تکلف اور تصنع

[1] الموسوعة العربية الميسرة :٦/ ٢٨٧٠، جواد علي، المفصل :٨/ ٨١٢

[2] الجرجاني، الطرائف الأدبية، ص: ٣، الألوسي، بلوغ الأرب :١/ ٢١-١٢٦

[3] الألوسي، بلوغ الأرب :١/ ٢٢، جواد علي، المفصل :٩/ ٤٨

کا نام نہیں ملتا۔ سادگی اور خلوص عربی شاعری کا طرۂ امتیاز ہے۔ عربی شاعری عربوں کے قومی اخلاق اور تاریخ کی پوری آئینہ داری کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عربوں کی شاعری کو ان کا قومی روزنامچہ قرار دیا گیا ہے۔ عربی شاعری میں حکیمانہ اقوال و افکار بھی بکثرت موجود ہیں۔

عربی شاعری کی وسعت اور ہردلعزیزی کا یہ حال ہے کہ زمانۂ جاہلیت کے ہزاروں شاعروں کے نام اور ان کا کلام اب تک محفوظ ہے۔ قدیم ترین شاعری کے بہترین نمونے کتاب الحَمَاسة ، سَبْع مُعلَّقات، الْمُفَضَّلِيَات، اَلاَصْمَعِيَّات، کتاب الاَغَاني وغیرہ میں موجود ہیں۔

عربوں کا دستور تھا کہ حج کے موسم میں دینی اجتماع اور عُکاظ کے قومی میلے کے موقع پر شاعرادَبی محفلیں جماتے، جہاں اپنا بہترین کلام سنایا کرتے تھے۔[1]

روم اور فارس میں آمدورفت کی وجہ سے عرب شاعروں کا رومیوں اور ایرانیوں سے میل جول اور اختلاط تھا، جس کا اثر ان کی شاعری میں جلوہ گر نظر آتا ہے۔ اسی طرح یہودیوں اور عیسائیوں سے بھی میل ملاپ کے باعث دینی افکار و خیالات بھی قدیم عربی شاعری میں پائے جاتے ہیں۔

مذہبی حالت

۱۔ اِسلام سے پہلے زمانے کو زمانۂ جاہلیت کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ زمانۂ جاہلیت میں جزیرۂ عرب کے باشندوں کی اکثریت بُت پرست تھی۔[2] بت پرستی کی داغ بیل ایک شخص عَمرو بن لُحَی نے ڈالی تھی۔ وہ ملک شام سے ہُبل نامی ایک بت لایا جسے کعبہ کے پاس نصب کر دیا۔[3] بس پھر کیا تھا، مدتوں کی بھٹکی ہوئی اور علم و حلم سے محروم

[1] ابن حبيب ، المحبر، ص: ۲٦۳، الألوسي ، بلوغ الأرب :۲٤۷/۱ـ ۲۳۰

[2] الألوسي، بلوغ الأرب :۳۹/۱ ، ۱۵۸/۲

[3] صحيح البخاري :٤٦۲۳

قوم نے بت پرستی کو اپنا شعار بنا لیا اور اسی میں نجات سمجھی۔ ہر قبیلے کا بت جُدا تھا۔ قریش کا سب سے بڑا بت ہُبل تھا جو انسانی شکل وصورت کا اور عقیق احمر کا بنا ہوا تھا۔[1] بیتُ اللہ شریف میں، جسے حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسمٰعیل علیہ السلام نے ایک اللہ کی عبادت کے لیے تعمیر کیا تھا، ۳۶۰ بت رکھے ہوئے تھے۔[2]

ایک بت کا نام مَنات تھا جو مکے اور مدینے کے درمیان ساحل سمندر پر نصب کیا گیا تھا۔ قبیلۂ اَوس، خزرج اور اَزد کے لوگ اس کی عبادت و تعظیم کرتے تھے اور اس کی نسبت سے عبد مَنات اور زید مَنات نام رکھتے تھے۔[3]

طائف میں ایک بت تھا جسے لات کہتے تھے۔ یہ مربع شکل کا پتھر تھا۔ بنوثقیف اس کے پجاری اور متولی تھے۔ اسی طرح عُزّیٰ بھی بڑا مشہور بت تھا جو وادی نخلہ میں بصورت درخت پُجتا تھا اور اسی کی نسبت سے عبدالعزّیٰ نام رکھا جاتا تھا۔ ینبع (مشہور بندرگاہ) میں سُواع نامی بت پوجا جاتا تھا۔ بنولحیان اس کے متولی تھے۔ بنوکلب کے ہاں وَدّ بت کی پوجا ہوتی تھی۔ اسی طرح یَعُوق، یَغُوث اور نَسر بھی بتوں کے نام تھے۔[4]

۲۔ بت پرستوں کے علاوہ جزیرۂ عرب میں صابئین بھی موجود تھے۔ یہ لوگ چاند، سورج اور ستاروں کی پرستش کرتے تھے۔[5]

۳۔ جزیرۂ عرب کے مشرق بالخصوص بحرین میں آتش پرست یعنی مجوس بھی پائے جاتے تھے۔ ان کا نظریہ یہ تھا کہ دنیا میں خیر اور شر دو قوتیں کارفرما ہیں۔ ان کے نزدیک روشنی اور نور خیر کی علامت تھی اور ظلمت و تاریکی شر کی۔ وہ لوگ آگ کو

---

[1] ابن حبيب، المحبر، ص: ۳۱۵، الموسوعة العربية الميسرة: ۲۱۱۱/٤، جواد علي، المفصل: ٤٩/٦-١٧٩

[2] صحيح مسلم: ۱۷۸۱، محمد رضا، محمد رسول الله ﷺ، ص: ۲۲٤

[3] جواد علي، المفصل: ۱۹۳/٦

[4] جواد علي، المفصل: ۱۷۹/٦

[5] جواد علي، المفصل: ٥٥٠/٦، إسلام محمود، موسوعة الفرق والأديان، ص: ۳۲٦

اس لیے پوجتے تھے کہ وہ روشنی اور نور کا سرچشمہ ہے۔[1]

۴۔ اس کے علاوہ اِسلام سے پہلے جزیرۂ عرب میں یہودی بھی آباد تھے۔ یمن، خیبر، تیماء اور یثرب میں ان کی تعداد خاصی تھی۔ بنوقُریظہ، بنونضیر اور بنوقَینُقاع یثرب کے مشہور یہودی قبیلے تھے۔ یہودی کھیتی باڑی، آہن گری اور اسلحہ سازی میں بڑے ماہر تھے۔ یہودی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پیرو ہیں۔ ان کی مقدس کتاب تورات ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی تھی۔ یہودی حشر نشر اور جزا وسزا پر ایمان رکھتے تھے۔[2]

۵۔ جزیرۂ عرب میں عیسائی بھی بستے تھے۔ یہ لوگ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ماننے والے تھے۔ ان کی مقدس کتاب کا نام انجیل ہے۔ عیسائیت نے قبیلۂ تغلِب، غسّان، قُضاعہ اور یمن کے علاقے میں قبولیت حاصل کی۔ عیسائی مذہب جزیرۂ عرب میں چوتھی صدی عیسوی میں داخل ہوا۔ مشرقی روم کے پادریوں نے عرب میں عیسائیت کی تبلیغ کے لیے سرتوڑ کوشش کی لیکن خاطر خواہ کامیابی حاصل نہ ہوسکی۔ البتہ نَجران کے بہت سے باشندوں نے عیسائیت کو قبول کرلیا۔[3]

نَجران بڑا آباد اور زرخیز علاقہ تھا۔ نَجران کے بہت سے لوگ کھیتی باڑی کرتے تھے۔ ریشمی اور دیگر کپڑے بُننے کے کارخانے بھی تھے۔ نیز چمڑے اور اسلحہ جات کے لیے مشہور تھا۔ عرب کے عیسائی شاعر بھی مشہور ہیں۔[4] نَجران کے عیسائیوں کا ایک وفد

[1] جواد علي، المفصل :٦/٥٤٢

[2] جواد علي، المفصل :٦/٤٢٥، إسلام محمود، موسوعة الفرق والأديان، ص: ٤٣٦-٥٠٤، الموسوعة العربية الميسرة: ٧/٣٦٥٦

[3] الموسوعة العربية الميسرة :٧/٣٣٧٤، جواد علي، المفصل: ٦/٤٥٥، إسلام محمود، موسوعة الفرق والأديان، ص: ٣٩٧

[4] البروسوي، أوضح المسالك، ص: ٦٢٢، ياقوت الحموي، معجم البلدان:٥/٢٦٦

حضرت رسولِ اکرم ﷺ کی خدمت میں مدینے حاضر ہوا تھا۔[1]

۶۔ عرب میں چند لوگ ایسے بھی موجود تھے جو توحید کے قائل تھے۔ ان کو حُنَفاء (حنیف کی جمع) کہتے تھے۔ یہ لوگ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تعلیمات کے پابند تھے اور شرک اور دوسری بُری رسموں سے اجتناب کرتے تھے۔ نیز لوگوں کو بت پرستی اور جاہلیت کی بُرائیوں سے روکتے تھے۔[2]

سیاسی حالت

ظہورِ اسلام کے وقت جزیرۂ عرب میں مروّجہ طرز کا کوئی باقاعدہ نظامِ حکومت موجود نہ تھا۔ جھگڑوں کے فیصلے کے لیے کوئی عدالت نہ تھی۔ امن قائم رکھنے کے لیے پولیس کا محکمہ نہ تھا اور بیرونی حملوں کی روک تھام کے لیے کوئی فوج بھی نہ تھی۔ عربوں کے ہاں اپنا کوئی سکہ اور ٹکسال بھی موجود نہ تھا۔

جزیرۂ عرب کے باشندے مختلف قبیلوں میں منقسم تھے۔ ہر ایک قبیلے کا اپنا اپنا سردار ہوتا تھا۔ سردار کا انتخاب کرتے وقت اس کی عمر، اثر و رسوخ، شخصی وقار و احترام، دولت کی کثرت اور ذاتی اقتدار و وجاہت کو مدِنظر رکھا جاتا تھا۔ عام طور پر سرداری ایک خاندان میں محدود ہو کر رہ جاتی تھی۔ قبیلے کا سردار جنگ کے وقت سپہ سالار ہوتا تھا اور امن کے زمانے میں قوم اور قبیلے کا خادم و نگران۔ اکثر اوقات انفرادی و ذاتی انتقام شخصی حق تصوّر ہوتا تھا۔ اَفراد انتقام کے معاملے میں خود مختار تھے۔ بعض اوقات یہ انفرادی معاملہ قبائلی چپقلش کی صورت اختیار کر لیتا تھا۔[3] معمولی معمولی باتوں پر جھگڑا ہو جاتا اور یہ جھگڑا کئی کئی نسلوں اور پشتوں تک رہتا تھا۔

---

[1] صحيح البخاري: ٤٣٨٠، صحيح مسلم: ٢٤٢٠

[2] جواد علي، المفصل: ٣٥١/٦

[3] جواد علي، المفصل: ٣٧/٤

جب کسی قبیلے کو موقع ملتا اپنے دشمن قبیلے پر حملہ کر کے لوٹ مار اور قتل و غارت گری کا بازار گرم کرتا۔ قبیلہ بکر اور تغلب کے درمیان ایک اونٹنی کی وجہ سے جھگڑا ہو گیا اور یہ سلسلہ چالیس برس تک جاری رہا۔ عربوں کے ہاں یہ واقعہ جنگِ بسوس کے نام سے مشہور ہے۔[1] اسی طرح ایک مرتبہ گھوڑے دوڑانے پر بنو عبس اور ذبیان کے درمیان تنازع ہو گیا اور اس کو جنگِ داحس و غبراء[2] کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ دونوں قبائل بھی برسوں تک برسرِ پیکار رہے۔[3]

زمانۂ جاہلیت میں جنگوں کا ایک اور مشہور سلسلہ بھی ہے جو ایام الفجار یا جنگ فجار کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ جنگیں زیادہ تر چار متبرک اور مقدس مہینوں میں لڑی گئیں۔ اس لیے فجار کے نام سے موسوم ہوئیں۔ کیونکہ عرب ذوالقعدہ، ذوالحجہ، محرم اور رجب کے مقدس مہینوں میں لڑنے جھگڑنے کو ان مہینوں کی عزت وحرمت کے منافی سمجھ کر جنگ سے اجتناب کرتے تھے۔ ان جنگوں میں قبیلۂ قریش، ہوازن، قیس، عیلان اور کنانہ نے حصہ لیا تھا۔[4]

عرب حکومتیں

اس قبائلی نظام کے علاوہ حضرت رسولِ اکرم ﷺ کی بعثت سے پہلے چند قدیم عرب حکومتوں کا پتہ بھی چلتا ہے۔ یہ حکومتیں باقاعدہ طور پر صاحب تاج وتخت حکمرانوں کے زیرِ نگیں تھیں۔ ان میں زیادہ مشہور حکومت کا نام سلطنتِ معین اور سبا ہے۔ حکومت معین بڑی

---

[1] ابن الأثير، الكامل: ۱/۵۲۳-۵۳۸، جواد علي، المفصل: ٤/٤٦٦

[2] گھوڑے اور گھوڑی کے نام جن کی دوڑ سے یہ فتنہ شروع ہوا اور ۴۰ سال تک دونوں فریقوں میں جنگ جاری رہی۔

[3] ابن الأثير، الكامل: ۱/٥٦٦، جواد علي، المفصل: ٥/٢٧٨-٢٨٢، ابن قتيبة الدينوري، المعارف، ص: ٢٦٢

[4] جواد علي، المفصل: ٤/٦٣، المسعودي، مروج الذهب: ٢/٣٩٠، ابن الأثير، الكامل: ١/٥٨٨-٦٧٦-٦٧٨، ابن قتيبة الدينوري، المعارف، ص: ٢٦٠

دولت مند اور صاحب ثروت تھی۔ اس کی تجارت دور دراز علاقوں تک پھیلی ہوئی تھی۔ یہاں بادشاہت وراثت سمجھی جاتی تھی۔ دولت مَعینیہ کا پتہ آثار قدیمہ کی کھدائی سے چلا ہے۔ اس سلطنت کے ۲۶ حکمرانوں کے نام ملے ہیں۔ اس کی حکومت نَجران اور حضرموت کے درمیانی علاقوں پر تھی۔ اس کا عہد حکومت از ۱۳۰۰ تا ۶۵۰ قبل مسیح تھا۔[۱]

دولت سَبا بھی حکومتِ مَعین کے ہم پلہ تھی۔ یہاں کے باشندے تجارت کے لیے بحری جہاز بھی استعمال کرتے تھے۔ تجارت اور تہذیب وتمدن میں سبا کے لوگوں نے بڑا نام پیدا کیا۔ سَبا کی مشہور ملکہ بِلقیس کا ذکر قرآن مجید میں بھی آیا ہے۔[۲] اس خاندان کا عہدِ حکومت ۹۵۰ تا ۱۱۵ قبل از مسیح تھا۔[۳] مَعین اور سَبَا کے علاوہ دولت حِمیر بھی بڑی شہرت کی مالک تھی۔[۴]

رومی اور فارسی حکمرانوں کی سیاسی اغراض کے باعث دو اور چھوٹی چھوٹی سرحدی حکومتیں بھی قائم ہو چکی تھیں، یعنی عراق میں سلطنتِ حیرہ اور شام میں سلطنتِ غسّان۔[۵]

معاشرتی حالت

زمانۂ جاہلیت میں بھی عربوں کے قومی اخلاق میں سخاوت و فیاضی، شجاعت و بہادری، عزت نفس، خاندانی وقار، جذبۂ حریّت، وفاداری اور ایفائے عہد کے اوصاف بڑے نمایاں ہیں۔ جغرافیائی حالات نے عربوں میں سخاوت اور فیاضی کوٹ کوٹ کر بھر دی تھی۔ اہلِ ثروت اور دولت مند طبقہ کا اخلاقی اور قومی فرض ہوتا تھا کہ مہمانوں کی خاطر تواضع کرے، حاجت مندوں کی ضرورتوں کو پورا کرے، غریب اور بے کس لوگوں کی امداد و اعانت کرے۔ خود بھوکا رہ کر مہمان کی ضیافت کرنا یا محتاج کی حاجت پوری کرنا

[۱] الموسوعة العربية الميسرة :٦/٣١٧٥ ، جواد علي ، المفصل :٢/٥٨-١٠١
[۲] النمل:٢٧/١٩-٤٤
[۳] جواد علي ، المفصل :٢/٢٠٢-٢٧٥، الموسوعة العربية الميسرة :٤/١٧٩٤
[۴] الموسوعة العربية الميسرة :٣/١٤١٥، جواد علي ، المفصل :٢/٣٩٥-٤١٠
[۵] جواد علي ، المفصل :٣/١٢٢-١٨٧، ٣٠٤-٣٥٢

مروّت اور جوانمردی کی نشانی سمجھا جاتا تھا۔

صحراؤں میں بعض لوگ اپنے گھروں کے سامنے کسی اُونچی جگہ رات بھر آگ روشن رکھتے تاکہ کوئی بھولا بھٹکا مسافر یا قافلہ روشنی کو دیکھ کر ادھر آ نکلے۔ ایسے مسافروں کے لیے رات کے وقت کھانے پینے کا انتظام بھی ہوتا تھا۔ یہ خوبی صرف دولت مند لوگوں تک ہی محدود نہ تھی بلکہ غریب اور مفلس لوگ بھی مہمانوں اور مسافروں کی مہمان نوازی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھتے تھے۔[1] مہمان نوازی اور سخاوت میں حاتم طائی کا نام اب تک زبان زدِ خاص و عام ہے۔[2]

عربوں کی وفاداری بھی ضرب المثل تھی۔ وہ اپنے خاندان اور قبیلے کے بڑے وفادار تھے۔ آپس میں کتنا ہی اختلاف کیوں نہ ہو عرب ایک دوسرے کا ساتھ نہ چھوڑتے۔ اگر مصیبت کے وقت اکثریت غلط راہ اختیار کر لیتی تو دانش مند لوگ بلکہ سرداران قبیلہ وفاداری کی خاطر قوم کا ساتھ دیتے، خواہ جان ہی دینی پڑے۔[3]

زمانۂ جاہلیت کے عربوں میں ایک بڑی خوبی ان کی بہادری اور شجاعت تھی۔ اپنے خاندان اور قبیلے کی آن اور عزت و ناموس کی خاطر جان پر کھیل جانا باعث فخر سمجھا جاتا۔ قدیم عربی شاعری درحقیقت شجاعت و بہادری اور سرفروشی و دلیری کی پوری داستان ہے۔ عربوں کا یہ عقیدہ تھا کہ قبیلے کی عزت اور وقار میں شخصی عزت و وقار مضمر ہے اور قبیلے کی ذلت سب کی ذلت ہے۔[4]

عورتوں کی عزت کی حفاظت کرنا اور قبیلے کی شہرت اور نیک نامی پر حرف نہ آنے دینا عربوں کے نزدیک مروّت اور جوانمردی میں شامل تھا۔[5]

---

[1] الألوسي، بلوغ الأرب: ۶۷/۱، جواد علي، المفصل: ۵۴/۵،۷۳/۴
[2] الموسوعة العربية الميسرة: ۱۳۱۰/۳، الزركلي، الأعلام: ۱۵۱/۲
[3] جواد علي، المفصل: ۲۹۲/۴
[4] الألوسي، بلوغ الأرب: ۱۱۷/۱
[5] جواد علي، المفصل: ۴۶۰/۴

آزادی اور خودمختاری بھی جاہلی عربوں کا قومی کردار تھا۔ عرب انفرادی اور قومی آزادی کو ہر قیمت پر برقرار رکھنا چاہتے تھے۔ انھیں یہ ہرگز گوارا نہ تھا کہ کسی شخص یا قبیلے کی آزادی چھن جائے۔[1]

عرب وعدے کے بڑے پکے تھے۔ ایفائے عہد کی خاطر جان یا عزیز سے عزیز چیز قربان کر دینا ان کے لیے معمولی بات تھی۔ ایک دفعہ وعدہ کر لیتے تو پھر اپنے الفاظ سے کبھی نہ پھرتے۔ سَمَوْأل بن عادِیا کا نام ایفائے عہد کے لیے ضرب المثل بن گیا ہے۔ بدعہدی اور وعدہ خلافی عربوں کے ہاں بہت بڑا عیب سمجھا جاتا تھا۔[2]

زمانۂ جاہلیت کے عربی معاشرہ میں عورتوں کو اچھی خاصی آزادی حاصل تھی۔ عورت کاروبار اور تجارت کر سکتی تھی۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی مثال ہمارے سامنے ہے۔[3] معاشرہ عورت کو عزت اور قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ اگرچہ بیاہ شادی کے معاملے میں والدین یا ولی اور سرپرست کو پورے اختیارات حاصل تھے، پھر بھی لڑکی کی رضامندی اور خوشنودی کا خیال رکھنا ضروری سمجھا جاتا تھا۔ میاں بیوی کی علیحدگی کے معاملے میں بھی بعض اوقات عورت کی مرضی کو دخل ہوتا تھا۔ عرب عورتیں مردوں کے ساتھ میدانِ جنگ میں جاتیں، زخمیوں کی مرہم پٹی کرتیں اور لڑائی کے وقت مردوں کو بہادری اور بے جگری سے لڑنے پر اکساتی تھیں۔[4]

بری رسوم و عادات

زمانۂ جاہلیت کے عرب معاشرہ میں جہاں بہت سے اوصاف اور خوبیاں موجود تھیں وہاں عرب معاشرہ کئی بُری رسموں اور بدعادتوں کا شکار تھا۔ عرب بڑے توہم پرست تھے۔ تفاؤل (شگون لینا) کا عام رواج تھا۔ پرندوں کی پرواز اور جانوروں کی آواز سے فال لی

---

1. جواد علي، المفصل: ٤/ ٣٠٤
2. الألوسي، بلوغ الأرب: ١/ ١٣٣، جواد علي، المفصل: ٤/ ٣٠٠
3. ابن الجوزي، الوفا بأحوال المصطفى: ١/ ١١٦
4. جواد علي، المفصل: ٤/ ٤٥٩-٤٦٦

جاتی تھی۔[1] جنات سے ڈرتے تھے۔[2] شراب نوشی عربوں کی گھٹی میں داخل تھی۔ شراب نوشی اور مے خوری کو اپنے اشعار میں فخریہ بیان کرتے تھے۔[3] جُوا اور قمار بازی بھی عام تھی۔ عربوں کا مال و دولت اونٹ تھے۔ قمار بازی میں بھی اونٹوں کی ہار جیت ہوتی تھی۔[4] افلاس اور عار کی وجہ سے بعض قبیلے لڑکیوں کو زندہ درگور کر دیتے تھے۔ ان قبیلوں میں جب کسی کے ہاں بچی پیدا ہوتی تو اسے زندہ ہی دفن کر دیا جاتا تھا۔[5]

سودی لین دین کا بھی رواج تھا۔ سود کی شرح بڑی ظالمانہ تھی۔ سرمایہ دار طبقہ سود کے طفیل غریبوں کا خون چوستا تھا۔[6] معمولی معمولی باتوں پر جنگ و جدال تک نوبت پہنچ جاتی تھی اور کئی کئی قبیلے برسوں تک برسرپیکار رہتے تھے۔[7] غربت و افلاس کی وجہ سے لوٹ مار اور چوری ڈاکہ عام تھا۔ پرائے جانوروں کو ہانک کر لے جانا اور ایک دوسرے کو قتل کر دینا فخر و غرور کی دلیل سمجھا جاتا تھا۔[8]

عرب اپنے دشمنوں سے بڑی بدسلوکی کرتے تھے۔ وہ دشمن کو معاف کر دینا جانتے ہی نہ تھے۔ خون کا بدلہ خون عربوں کا قومی نعرہ تھا۔ ان کے نزدیک انتقام اور جنگ و جدال ہی میں زندگی کا راز پنہاں تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ بدلہ ضرور لیا جائے۔ انتقام کی کوئی میعاد مقرر نہیں، جب بس چلے اور موقع ہاتھ آئے انتقام لے لینا چاہیے۔[9]

---

[1] جواد علي، المفصل :٦/٦١٦ ، الألوسي ، بلوغ الأرب :٢/٢٦٩ ، ٣/٢٥١

[2] سبا :٣٤/٤١ ، الجن :٧٢/٦

[3] جواد علي، المفصل :٩/٩٠

[4] الألوسي، بلوغ الأرب :٣/٤٥

[5] الألوسي ، بلوغ الأرب :٣/٣٦ ، جواد علي ، المفصل :٥/٧٠

[6] جواد علي ، المفصل :٧/٣٢٤

[7] ابن الأثير، الكامل :١/٥٠٢

[8] جواد علي، المفصل :٥/٤٥٣

[9] الألوسي، بلوغ الأرب :٣/٢٢

کعبہ

جزیرۂ عرب میں مکّہ مکرمہ بڑا مشہور اور مرکزی شہر ہے جو ایک تنگ مگر طویل وادی میں واقع ہے۔ تمام علاقہ بنجر اور غیر زرعی ہے۔ شہر کے چاروں طرف اُونچے اُونچے پہاڑ ہیں۔ زَم زَم کا کنواں بھی قریب ہی ہے۔ مکہ بندرگاہ سے تقریباً ۴۵ میل کے فاصلے پر ہے۔[۱]

مکے کو اُمّ القریٰ،[۲] بَلَدِ امین[۳] اور بَکّہ[۴] کے ناموں سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ بکّہ اور مکہ بابلی زبان میں بَیت یعنی گھر کے معنوں میں استعمال ہوتے ہیں، اس لیے بعض مؤرخوں نے بیت العتیق بھی مکّہ مکرّمہ کے لیے استعمال کیا ہے۔[۵] اس مقدّس شہر کی شہرت اور بزرگی و برکت بیت اللہ یا کعبہ کی وجہ سے ہے جسے حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے بیٹے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام نے بنایا تھا۔[۶] کیونکہ یہ مکعب عمارت ہے اس نسبت سے اسے کعبہ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔[۷] جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت ہاجرہ علیہا السلام اور حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو مکے میں آباد کیا تو آپ علیہ السلام نے دعا مانگی تھی:

> ”اے اللہ! میں نے ان لوگوں کو بے آباد اور غیر زرعی بستی میں بسایا ہے تو مہربانی فرما، اس شہر کو امن و سلامتی کا مرکز قرار دے۔ لوگوں کے دلوں کو ان کی طرف مائل کر دے۔“[۸]

---

۱ البروسوي، أوضح المسالك، ص: ٦٠١، ياقوت الحموي، معجم البلدان: ١٨١/٥

۲ الأنعام: ٩٢/٦، الشورى: ٧/٤٢

۳ التين: ٣/٩٥

۴ آل عمران: ٩٦/٣

۵ الحج: ٢٩/٢٢

۶ البقرة: ١٢٧/٢

۷ المائدة: ٩٥/٥، مرتضى الزبيدي، تاج العروس: ٣٧٥/٢

۸ إبراهيم: ٣٥/١٤-٣٧، (مختصر ترجمہ)

اللہ تعالیٰ نے یہ دُعا قبول فرمالی اور ابراہیم علیہ السلام کو حکم دیا کہ لوگوں میں حج بیت اللہ کا اعلان کردو۔ لوگوں سے جیسے بھی بن پڑے گا یہاں پہنچیں گے۔ چنانچہ لوگ ہر طرف سے بیت اللہ شریف میں حاضر ہونے لگے۔[1]

بیت اللہ کو بیت الحرام، بیت العتیق اور کعبہ کے ناموں سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔[2]

کعبہ کا انتظام، حاجیوں کی خدمت اور مکے کی حکومت ابتدا میں بنوجُرہُم کے ہاتھ میں رہی۔ اس کی بدولت قبیلۂ جرہم کو بڑا اقتدار اور تسلّط حاصل ہوگیا۔ بعد ازاں بنوخُزاعہ نے بنوجُرہُم کو جلاوطن کر کے زمامِ حکومت خود سنبھال لی۔ بنوخُزاعہ تقریباً تین سو برس تک کعبہ کے متولی اور پاسبان رہے۔ اس عرصے میں اُنھوں نے شرک و بدعت کو بڑا رواج دیا۔ بالخصوص ہُبل بت کی پوجا کو عام کر دیا۔[3]

پانچویں صدی عیسوی میں قبیلۂ قریش نے بڑی قوت حاصل کر لی، نتیجہ یہ ہوا کہ قریش نے بنوخُزاعہ کو مار بھگایا۔ چنانچہ ۴۴۰ء میں کعبہ کا انتظام اور مکے کی حکومت قریش کے سردار قُصَی بن کِلاب کے ہاتھ میں آ گئی۔ اس وجہ سے قُصَی کا اقتدار اور اثر ورسوخ بہت بڑھ گیا۔ حاجیوں کی خدمت اور مہمان نوازی، پانی کا انتظام اور کعبہ کی تولیت و پاسبانی سب کچھ قُصَی نے سنبھال لیا۔ کعبہ کے اردگرد کی جگہ کو متبرک و مقدس قرار دے کر اس میں قتل و خون ریزی اور جنگ وجدال کو ممنوع ٹھہرایا۔ اس طرح کعبہ کی خدمت و پاسبانی قریش میں منتقل ہوگئی۔[4]

قریش

بیت اللہ کے متولی اور پاسبان ہونے کی وجہ سے قریش تمام قبیلوں میں بڑی

---

[1] الحج: ۲۲/۲۷

[2] المائدة: ۵/۹۵-۹۷۔ بیت اللہ کے ناموں کے متعلق دیکھیں الفاسی کی کتاب "شفاء الغرام بأخبار البلد الحرام: ۱/۹۳-۴۲

[3] المسعودي، مروج الذهب: ۲/۵۴، ۶۱

[4] المسعودي، مروج الذهب: ۲/۶۳، الموسوعة العربية الميسرة: ۵/۲۰۶۷

قدر و منزلت اور عزت و احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ جس طرح جزیرۂ عرب میں کعبہ کو مرکزی حیثیت حاصل تھی اسی طرح قبائل عرب میں قریش کو مرکزی قوت سمجھا جاتا تھا اور قریش کی سرداری اور رہنمائی ایک مسلمہ امر تھا۔

قبیلۂ قریش کے پہلے صاحب اقتدار و اختیار سردار کا نام قُصَیّ بن کِلاب تھا۔ یہی وہ سردار تھا جس نے قریش کے مختلف خاندانوں کو اکٹھا کر کے ان میں اتفاق و اتحاد پیدا کیا اور خود بیت اللہ شریف کا دینی و مذہبی سردار اور مکے شریف کا پہلا جمہوری حاکم قرار پایا۔ قُصَیّ بڑا دانا، ہوش مند اور جمہوریت پسند راہنما تھا۔ اس نے مکہ مکرمہ میں جمہوری نظامِ حکومت کی داغ بیل ڈالنے کی کوشش کی اور جمہوری اُصولوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے بہت سے انتظامی شعبے اور محکمے قائم کیے۔ اس کے دو فائدے ہوئے: ایک تو یہ کہ مختلف خاندانوں کو اقتدار اور خدمت کے بہانے اپنے ساتھ رکھا، دوسرے یہ کہ ذمہ داری کے علاوہ تمام اُمور میں کفایت، خوش اسلوبی اور حسن کارکردگی پیدا ہوگئی۔[1]

قُصَیّ کی جمہوریت

قُصَیّ کے جمہوری نظام میں چار چیزیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں:

۱۔ قُصَیّ نے دارُالنّدوہ کی بنیاد رکھی۔ دارُالندوہ عربوں کا پہلا اسمبلی چیمبر تھا۔ یہاں قریش کے تمام خاندانوں کے سردار اور دانشمند لوگ جمع ہوتے اور سیاسی، اجتماعی، مذہبی اور قومی مسائل پر غور و فکر کے بعد فیصلے کرتے۔ شادی بیاہ کے معاملات بھی یہیں طے پاتے۔ چالیس برس سے کم عمر کے لوگ دارالندوہ کے رکن نہ بن سکتے تھے۔ دارالندوہ وزارت داخلی اور عدلیہ کے برابر تھا۔[2]

---

[1] الموسوعة العربية الميسرة :٥/٢٥٥٤، الزركلي ، الأعلام :٥/١٩٨

[2] الموسوعة العربية الميسرة :٣/١٤٦٩، الأزرقي ، أخبار مكة: ٢/٢٥٢

۲۔ اَللِّوَاء یا عَلَم (قومی جھنڈا) کا شعبہ۔ دراصل یہ شعبہ وزارتِ دفاع یا محکمہ دفاع کے برابر تھا۔ جنگ کے تمام اُمور اس محکمہ کے سپرد تھے۔[1]

۳۔ کعبہ شریف کی تولیت اور پاسبانی۔ یہ شعبہ بنو عبدالدّار کے سپرد تھا۔ مُتَوَلّی کے بغیر دوسرا کوئی شخص کعبہ کا دروازہ کھولنے کا مجاز نہ تھا۔ بیت اللہ کی کُنجی مُتَوَلّی کعبہ کے پاس رہتی تھی۔ کعبہ کی تمام خدمات مُتَوَلّی کے سپرد تھیں، جسے عرب حاجبِ کعبہ (یعنی کعبہ شریف کا دربان اور پاسبان) کہتے تھے۔[2]

۴۔ حاجیوں کے لیے کھانے پینے کا اہتمام۔ لوگ دُور دراز علاقوں سے حج بیت اللہ کے لیے مکہ مکرّمہ میں آتے۔ اہلِ مکہ حاجیوں کے پینے کے لیے زمزم کے پانی سے بہت سے حوض بھر دیتے اور کھجوریں ڈال کر پانی کو میٹھا اور شیریں بنا دیتے تھے۔ ظہورِ اسلام کے وقت پانی پلانے کا انتظام عباس بن عبدُ المُطّلِب کے سپرد تھا۔[3]

قُصَیّ سے پہلے قریش کے صرف چند گھرانے حاجیوں کے لیے ضیافت اور مہمان نوازی کا اہتمام کرتے تھے۔ قُصَیّ نے اس خدمتِ مُحْتاج کو ایک قومی تحریک کی شکل دے کر قریش کے تمام گھرانوں پر قومی ٹیکس لگا دیا۔ قریش کا ہر فرد سال کے بعد ایک مقررہ رقم ادا کرتا۔ اس رقم کو عربوں کی اصطلاح میں ''خَرج'' کہتے تھے۔ اس طرح جتنی رقم جمع ہوتی وہ حاجیوں کی مہمان نوازی پر صَرف کر دی جاتی تھی۔ قُصَیّ کی موت کے بعد اس کا بیٹا عبدمناف ضیافت و مہمان نوازی کا انتظام کرتا رہا۔ پھر عبدمناف کا بیٹا ہاشم، پھر ہاشم کا بیٹا عبدُ المُطّلِب۔ پھر عبدُ المُطّلِب کے بیٹے ابو طالب اور عبّاس یکے بعد دیگرے یہ

---

[1] جواد علي، المفصل: ٤/٤٥

[2] جواد علي، المفصل: ٥/١٩٤۔ ٢٢٣

[3] الزركلي، الأعلام: ٣/٢٦٢

خدمت انجام دیتے رہے۔[1]

قریش کے خاندان میں ہاشم نے بڑی شہرت اور ناموری حاصل کی۔ ہاشم نے قریش کے لیے غیر ممالک بالخصوص شام اور حبش کے ملکوں میں تجارتی اور کاروباری سہولتیں حاصل کر کے قریش کی تجارت کو بڑا فروغ دیا۔[2]

عبدالمُطّلِب کا عہد

جب حضرت محمد ﷺ کے دادا عبد المُطلِب قبیلے کے سردار بنے تو سارے عرب میں قریش کی شہرت کا ڈنکا بجنے لگا۔ عبد المُطلِب کے زمانے میں بئر زمزم (زمزم کا کنواں) مٹی وغیرہ سے بھر گیا تھا۔[3] یہ وہی چشمہ یا کنواں ہے جو حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے لیے اللہ تعالیٰ نے جاری فرمایا۔ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو بچپن میں شدت کی پیاس محسوس ہو رہی تھی، چاروں طرف کہیں پانی نظر نہ آتا تھا، آپ علیہ السلام جس جگہ لیٹے پاؤں مار رہے تھے وہاں زمین سے پانی پھوٹ کر بہنے لگا۔[4]

اس چشمہ کو بئر زمزم کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ بہر حال عبدالمُطلِب نے اس چشمے کو دوبارہ صاف کرایا۔ مٹی وغیرہ نکلوا کر از سرنو پانی جاری کیا۔[5]

عبد المُطلِب کے عہد میں یَمَن کے حاکم اَبرَہہ نے چالیس ہزار کا لشکر لے کر مَکّہ مکرمہ پر چڑھائی کر کے بیت اللہ شریف کو منہدم کرنا چاہا لیکن عبد المُطلِب نے کہا کہ یہ اللہ کا گھر

[1] جواد علي، المفصل: ۱۹۳/۵

[2] الزركلي، الأعلام: ۶۶/۸، ابن سعد، الطبقات الكبرى: ۷۵/۱

[3] ابن إسحاق، السيرة النبوية، ص: ۷۷

[4] صحيح بخاري: ۳۳۶۴

[5] ابن إسحاق، السيرة النبوية، ص: ۷۷

ہے، اللہ اپنے گھر کی خود حفاظت کرے گا۔ چنانچہ جب اَبرَہہ کی ہاتھیوں والی فوج نے مکہ کے قریب مُغمَس کے مقام پر ڈیرے ڈالے تو اللہ تعالیٰ نے پرندوں کے غول اور جھنڈ بھیج کر دشمنانِ کعبہ کو نیست و نابود کر دیا۔ قرآن مجید کی سورۃ الفیل میں یہ واقعہ مذکور ہے اور تاریخ میں اس کو عام فیل کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔[1]

[1] [illegible]

سیرت النبی ﷺ

(ظہورِ اسلام)

جزیرۃ العرب
عہدِ نبوی ﷺ میں
بحیرہ روم
شام
بیت المقدس
حیرہ
دومہ
تبوک
حجاز
خیبر
مدینہ
نجد
بحرین
خلیج فارس
ایران (فارس)
عمان
بدر
مکہ
طائف
مصر
مہرہ
حضرموت
نجران
صنعاء
یمن
خلیج عدن
بحیرہ عرب
حبشہ

پہلا باب
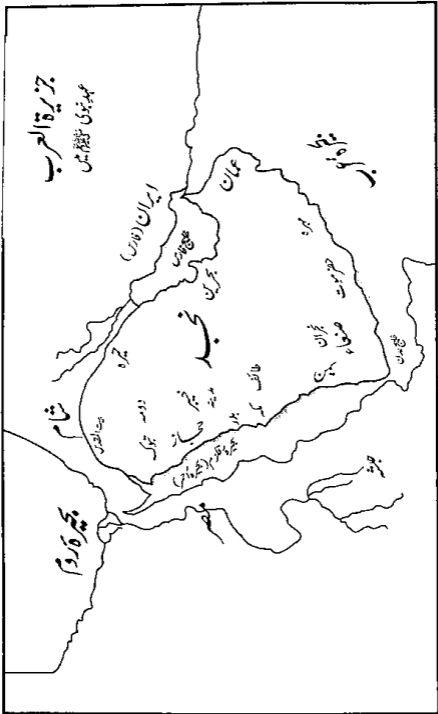
سیرت النبی ﷺ

(ابتدائی حالات)

خاندان، ولادت، بچپن، جوانی، تجارت اور نکاح

خاندان

حضرت رسولِ اکرم ﷺ قریش کے معزز خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ آپ ﷺ کے دادا کا نام عبدُ المُطّلِب تھا اور عبدُ المُطّلِب کے والد کا نام ہاشم بن عبد مناف بن قُصَی بن کلاب تھا۔[1] یہ لوگ قریش کے سردار تھے۔ بیت اللہ شریف کا انتظام اور حاجیوں کی خدمت و مہمان نوازی اسی خاندان کے سپرد تھی۔[2]

عبدُ المُطّلِب کا بڑا اثر و رسوخ تھا۔ قبیلۂ قریش کے علاوہ دوسرے خاندان بھی ان کی بڑی عزّت و تعظیم کرتے تھے۔ عبدُ المُطّلِب کے بارہ بیٹے تھے:

۱۔ عبدالکعبہ ۲۔ ضِرار ۳۔ قُثم ۴۔ زُبَیر ۵۔ مُقَوَّم ۶۔ حارِث
۷۔ ابولَہَب ۸۔ غَیداق ۹۔ حمزہ ۱۰۔ عباس ۱۱۔ ابوطالب ۱۲۔ عبداللہ۔[3]

حضرت عبداللہ سب سے چھوٹے اور ماں باپ کے بڑے لاڈلے اور پیارے تھے۔

جب آپ جوان ہوئے اور کاروبار کرنے لگے تو آپ کا نکاح مکہ ہی کے ایک معزز گھرانے کی لڑکی بی بی آمنہ سے ہوا۔[4] تھوڑا عرصہ بعد حضرت عبداللہ تجارت کے لیے ملک شام کو

---

[1] ابن الأثیر، الکامل: ۱/۵

[2] جواد علي، المفصل: ٤/٤٥ و ٥/١٩٤-٢٢٣، المسعودي، مروج الذهب: ٢/٦٣

[3] ابن إسحاق، السیرة النبویة، ص: ٨٥

[4] ابن الجوزي، الوفا بأحوال المصطفی: ١/٧٤-٧٦

روانہ ہوئے مگر وہاں پہنچ کر بیمار ہو گئے۔ بیماری کی حالت میں واپس آ رہے تھے کہ یثرب سے گزرتے ہوئے اپنے والد عبدالمطلب کی ننہال میں ٹھہر گئے اور وہیں وفات پائی۔[1]

وِلادتِ باسعادت

حضرت عبداللہ کی وفات کے چند مہینے بعد بتاریخ ۲۰ اپریل ۵۷۱ء بروز پیر اللہ تعالیٰ نے حضرت آمنہ کو ایک سعادت مند بیٹا عطا کیا جس کا نام دادا نے محمد (ﷺ) رکھا۔ تمام مؤرخین کا اتفاق ہے کہ آپ کی وِلادت باسعادت پیر کے دن ربیع الاول کے مہینے میں ہوئی۔ بعض ربیع الاول کی ۹ تاریخ بتاتے ہیں اور بعض ۱۳،۱۱ اور ۱۲۔ یہ سال عامِ فیل کے نام سے مشہور ہے۔[2]

تربیت

مکہ مکرمہ کے شرفاء کا یہ دستور تھا کہ وہ اپنے دودھ پیتے بچوں کو اچھی تربیت کے لیے صحرا یا دیہات میں بھیج دیتے تھے تاکہ ننھے بچے کھلی اور صحت بخش تازہ ہوا میں پرورش پائیں۔

جب ہمارے پیغمبر ﷺ چھ ماہ کی عمر کو پہنچے تو آپ ﷺ کو بھی قبیلہ بنی سعد کی ایک خاتون مائی حلیمہ کے سپرد کر دیا گیا۔ مائی حلیمہ آپ ﷺ کو شہر سے باہر لے گئیں، جہاں آپ ﷺ چار پانچ برس تک رہے۔ اس عرصہ میں ایک مرتبہ مائی حلیمہ آپ ﷺ کو واپس مکہ لائیں مگر شہر میں وبا پھیلی ہوئی تھی، اس لیے حضرت آمنہ نے اپنے نورِ نظر اور لختِ جگر کو دوبارہ مائی حلیمہ کے سپرد کر دیا، تاکہ چندے اور شہر سے باہر کھلی اور صاف ہوا میں پرورش پائیں۔[3]

مائی حلیمہ کے اپنے بال بچے بھی تھے۔ حضرت رسولِ اکرم ﷺ بچپن میں ان بچوں کے

---

[1] تاريخ الطبري: ۲/۲٤٦ ،ابن كثير، البداية والنهاية: ۳/۳۰

[2] ابن سيد الناس ، عيون الأثر: ۱/۲٦ ، الذهبي ، تاريخ الإسلام: ۱/۲۳ ، تاريخ الطبري: ۲/۱۵۵ ، ابن كثير، البداية والنهاية: ۳/۳۱

[3] ابن الجوزي ، الوفا بأحوال المصطفى: ۱/۸۹، ۹۲، ابن إسحاق ، السيرة النبوية ، ص: ۱۰۲ ، الذهبي، تاريخ الإسلام: ۱/٤۱

ساتھ کھیلتے رہے اور ذرا بڑے ہوئے تو اُن کے ساتھ مل کر بکریاں چرانے لگے۔[1]

چار پانچ سال کے بعد مائی حلیمہ آپ ﷺ کو مکّہ مکرّمہ میں واپس لے آئیں۔ آپ ﷺ بڑے توانا اور تندرست تھے۔ آپ ﷺ کو صحت مند اور موٹا تازہ دیکھ کر آپ ﷺ کے دادا اور آپ ﷺ کی والدہ محترمہ بہت خوش ہوئیں۔[2]

بچپن

گھر میں واپس آئے تو اپنی والدہ محترمہ کے پاس رہنے لگے۔ حضرت آمنہ کو اپنے پیارے بیٹے کا بڑا خیال تھا۔ وہ آپ ﷺ کو ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتی تھیں۔ جب حضرت رسولِ خدا ﷺ کی عمر سوا چھ برس کی ہوئی تو آپ ﷺ کی والدہ ماجدہ آپ ﷺ کو ساتھ لے کر یثرب میں آپ کے دادا کے ننھیال گئیں۔ وہاں ایک مہینہ قیام فرمانے کے بعد جب واپس تشریف لا رہی تھیں تو مدینہ اور مکہ کے درمیان مقام اَبْواء میں وفات پائی اور اسی جگہ دفن ہوئیں۔[3]

اس سفر میں حضرت رسولِ مقبول ﷺ کی کھلائی اور خادمہ اُمِّ اَیْمن بھی ساتھ تھیں۔ حضرت آمنہ کی وفات کے بعد اُمِ ایمن آپ ﷺ کو لے کر مکہ واپس آئیں اور آپ کے دادا کے سپرد کیا۔[4] ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات، دادا کی دُور بین نگاہ نے چھوٹے بچے کا مستقبل بڑا روشن دیکھا۔ بڑی قدر و منزلت اور لاڈ اور پیار سے پالا۔ دادا اکثر کہا کرتا تھا کہ یہ بچہ جوان ہو کر نہایت برگزیدہ اور عظیم الشان ہستی قرار پائے گا۔[5]

---

[1] صحیح البخاري: ٢٢٦٢، الذهبي، تاريخ الإسلام: ٤٧/١، ابن سعد، الطبقات الكبرىٰ: ١٢٥/١، ابن سيد الناس، عيون الأثر: ٤٥/١

[2] ابن سيد الناس، عيون الأثر: ٣٤/١، ابن هشام، السيرة النبوية: ١٦٥/١

[3] ابن هشام، السيرة النبوية: ١٦٨/١۔ نوٹ: جناب عبدالمطلب کی والدہ یعنی حضرت عبداللہ کی دادی سلمٰی بنت عمرو یثرب کے بنونجار قبیلے سے تھیں، اس اعتبار سے ننھیال کا لفظ لکھا جاتا ہے۔ ورنہ حضرت آمنہ کا میکہ اور آنحضرت ﷺ کا ننھیال مکہ مکرمہ ہی سے تھا۔ الخركوشي، شرف المصطفى: ٣٤٠/١

[4] محمود شاكر، التاريخ الإسلامي: ٣٦/١

[5] البيهقي، دلائل النبوة: ٢٢/٢، المقريزي، إمتاع الأسماع: ٩٥/٤٤

والدہ کی وفات کے بعد دادا نے گود میں لے کر آپ ﷺ کی تربیت و کفالت کا ذمہ لیا، مگر دادا بھی بوڑھے ہو چکے تھے۔ ابھی دو سال بھی گزرنے نہ پائے تھے کہ عبد المُطلب نے بھی سفرِ آخرت اختیار کیا۔ دنیا سے رُخصت ہونے سے پہلے عبد المُطلب نے آپ ﷺ کو اپنے بیٹے ابو طالب کے سپرد کر دیا۔ اس وقت آپ ﷺ کی عمر آٹھ برس کی تھی۔ دادا کی وفات کے بعد آپ ﷺ کے چچا ابو طالب نے آپ ﷺ کو اپنی آغوشِ تربیت میں لے لیا۔

ابو طالب نے حضرت رسولِ مقبول ﷺ کو بڑی محنت اور شفقت سے پالا اور اپنی اولاد سے بڑھ کر آپ ﷺ کی نگرانی اور خبر گیری کی۔[1]

شام کا پہلا سفر

بارہ برس کی عمر میں آپ ﷺ شفیق چچا کے ہمراہ ملک شام تشریف لے گئے۔ مہربان چچا کا ذریعۂ معاش تجارت تھا اور وہ تجارت کا مال لے کر ملک شام کو جایا کرتے تھے۔ آپ ﷺ کی کم سنی کی وجہ سے وہ آپ ﷺ کو ساتھ لے جانا نہیں چاہتے تھے مگر آپ ﷺ کا اصرار و اضطراب دیکھ کر ابو طالب آپ ﷺ کو ساتھ لے جانے پر مجبور ہو گئے۔ یہ آپ ﷺ کا پہلا سفر تھا۔ اسی سفر میں بُصریٰ کے بَحیرا راہب کی دُور بین نظریں علاماتِ نبوت بھانپ گئیں اور اس نے ابو طالب کو مشورہ دیا کہ آپ ﷺ کو شام میں نہ پھرائیں، کیونکہ یہودیوں کی طرف سے خطرہ ہے۔ چنانچہ اُنھوں نے اپنے غلاموں کے ساتھ آپ ﷺ کو مکہ پہنچا دیا۔[2]

اس وقت عرب میں لکھنے پڑھنے کا دستور نہ تھا۔ اس لیے حضرت رسولِ مقبول ﷺ نے بھی لکھنا پڑھنا نہ سیکھا، البتہ شفیق چچا کے ساتھ رہ کر کاروبار کرنا خوب سیکھ لیا۔

---

[1] ابن سید الناس، عیون الأثر: ۳۸/۱، ابن هشام ، السيرة النبوية: ۱۶۸/۱۔ ۱۷۹ ، ابن كثير، البداية والنهاية: ۶۷/۳، ابن سعد، الطبقات الكبرى: ۱۱۸/۱

[2] ابن كثير، البداية والنهاية: ۷۰/۳، الذهبي ، تاريخ الإسلام: ۴۷/۱ ، ابن سيد الناس، عيون الأثر: ۴۰/۱ ، ابن كثير ، السيرة النبوية: ۲۴۳/۱، البيهقي ، دلائل النبوة: ۲۴/۲

ایامِ جوانی

حضرت رسولِ مقبول ﷺ اپنے چچا کے زیر سایہ پرورش پا کر آہستہ آہستہ جوانی کی عمر کو پہنچے، مگر نہ لڑکپن میں لڑکوں کے ساتھ بہت کھیلے اور نہ جوانی میں جوانوں کی بُری صحبت میں بیٹھے۔[1]

جب آپ ﷺ کی عمر چودہ برس کے قریب ہوئی تو قریش اور قَیس عَیلان کے قبیلوں کے درمیان لڑائی شروع ہوگئی۔ یہ لڑائی جنگِ فِجار کے نام سے یاد کی جاتی ہے۔ حضرت رسولِ اکرم ﷺ بھی اپنے قبیلے کے ساتھ اس جنگ میں شریک ہوئے۔ البتہ آپ ﷺ کا کام صرف اتنا تھا کہ آپ ﷺ ترکش سے تیر نکال کر اپنے چچا کو پکڑاتے جاتے تھے۔[2]

آئے دن کی لڑائی جھگڑوں سے تنگ آکر قریش کے نیک دل لوگوں نے سوچا کہ امن و امان قائم رکھنے کے لیے آپس میں ایک معاہدہ ہونا چاہیے۔ چنانچہ سب نے مل کر یہ عہد کیا کہ ہم میں سے ہر آدمی مظلوم کی حمایت کرے گا اور اب کوئی ظالم مکہ معظمہ میں رہنے نہ پائے گا۔ حضرت رسولِ مقبول ﷺ بھی اس معاہدے میں شریک تھے۔ یہ معاہدہ ''حِلفُ الفُضُول'' کے نام سے مشہور ہے۔[3]

تجارت

جب آپ ﷺ جوان ہوئے تو شُرفائے قریش کی طرح آپ ﷺ نے بھی تجارت شروع کر دی۔ تجارت کے سِلسلہ میں آپ ﷺ نے یَمَن، شام اور دوسرے علاقوں کا سفر کیا۔ آپ ﷺ کے پاس اپنا سرمایہ نہ تھا، اس لیے دوسرے لوگوں کے ساتھ مل کر کاروبار کرتے تھے۔[4]

---

[1] المستدرك للحاكم: ۷٦۹۳، السيوطي، خصائص الكبرىٰ: ۱/ ۸۸

[2] ابن هشام، السيرة النبوية: ۱/ ۱۸٤، ابن كثير، البداية والنهاية: ۳/ ۷۹، المقريزى، إمتاع الأسماع: ۱/ ۱٦، ابن سعد، الطبقات الكبرىٰ: ۱/ ۱۲٦

[3] ابن سعد، الطبقات الكبرىٰ: ۱/ ۱۲۸، أبو زهرة، خاتم النبيين: ۱/ ۱۳۳، ابن سيد الناس، عيون الأثر: ۱/ ٤٦، ابن كثير، البداية والنهاية: ۳/ ۸۲

[4] المقريزي، إمتاع الأسماع: ۸/ ۱۷٤، ابن الجوزي، الوفا بأحوال المصطفى: ۱/ ۱۱٦

صِدق

آپ ﷺ کی سچائی، نیکی اور اچھے برتاؤ کی بڑی شُہرت تھی۔ آپ ﷺ ہر بات میں ہمیشہ سچا وعدہ کرتے اور جو وعدہ کرتے اسے پورا کرتے تھے۔ تجارتی لین دین میں آپ ﷺ ہمیشہ نرمی سے کام لیتے تھے۔ تجارت کے کاروبار میں آپ ﷺ نے کبھی کسی سے جھگڑا نہیں کیا۔ آپ ﷺ معاملہ کے بڑے صاف اور سچے تھے۔ اسی لیے صادق مشہور ہوئے۔[1]

اَمانت

قریش کے لوگ آپ ﷺ کی ایمانداری، دیانتداری اور اچھے برتاؤ کی وجہ سے آپ ﷺ پر پورا بھروسہ رکھتے تھے۔ وہ اپنا سرمایہ آپ ﷺ کے سپرد کر دیتے تھے۔ کئی لوگ اپنا روپیہ پیسہ آپ ﷺ کے پاس امانت رکھ جاتے تھے۔ اسی لیے لوگ آپ کو امین کہتے تھے۔[2]

شام کا دوسرا سفر

مکّہ مکرّمہ میں خدِیجہ ؓ نامی ایک بیوہ خاتون رہتی تھیں۔ اُنھوں نے اپنا روپیہ تجارت میں لگا رکھا تھا۔ حضرت رسولِ اکرم ﷺ اس بیوہ خاتون کا سامان لے کر پھر ملک شام کو گئے اور شہر بُصریٰ تک سفر کیا۔ بی بی خدیجہ ؓ نے اپنے غلام مَیسرہ کو بھی آپ ﷺ کے ساتھ بھیجا تھا۔ اس تجارت میں بڑا نفع ہوا۔ واپس آئے تو حضرت خدیجہ ؓ نے آپ ﷺ کی سچائی، نیکی، دیانتداری اور اچھے اخلاق کی شہرت سُنی اور آپ ﷺ کے برتاؤ اور کام سے بہت خوش ہوئیں۔[3]

---

[1] ابن هشام، السيرة النبوية: ١/١٨٩، البيهقي، دلائل النبوة: ٢/٦٧، مسند أحمد: ٥/١٥٥٠٥

[2] المستدرك للحاكم: ١٧٢٦، الطبراني، المعجم الأوسط: ٢٤٤٢

[3] البيهقي، دلائل النبوة: ٢/٦٥، تاريخ الطبري: ٢/٢٨٠، ابن سيد الناس، عيون الأثر: ١/٤٧، الديار بكري، تاريخ الخميس: ١/٢٦٢، ابن الجوزي، الوفا بأحوال المصطفى: ١/١١٦

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے نکاح

اس سفر سے واپس آئے دو تین مہینے گزرے تھے کہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے آپ ﷺ سے نکاح کی درخواست کی۔ اس وقت حضرت رسولِ اکرم ﷺ کی عمر پچیس سال کی تھی اور حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی عمر چالیس سال کی۔ پھر بھی آپ ﷺ نے یہ درخواست قبول فرمالی اور چند روز کے بعد رسم نکاح بڑی سادگی سے انجام پا گئی۔ اس تقریب میں آنحضرت ﷺ کے چچا ابو طالب اور حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ بھی موجود تھے۔ ابوطالب نے نکاح کا خطبہ پڑھا۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی اولاد میں حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سب سے زیادہ مشہور ہیں۔[1]

اس کے بعد آنحضرت ﷺ اپنا کاروبار برابر کرتے رہے اور اس سلسلے میں عرب کے مختلف شہروں میں آتے جاتے رہے۔[2] آپ ﷺ کی امانت، دیانت، نیکی اور سچائی کا ہر طرف چرچا تھا۔

نَصبِ حجرِ اَسوَد

حضرت رسولِ اکرم ﷺ کی عمر پینتیس ۳۵ برس کی ہوئی تھی کہ زور کا مینہ برسنے کی وجہ سے کعبہ کی عمارت خراب ہوگئی۔ قریش کے سب خاندانوں نے مل کر کعبہ کو نئے سرے سے بنانا شروع کیا۔ آنحضرت ﷺ بھی قریش کے دوسرے لوگوں کی طرح پتھر اٹھا کر لاتے تھے۔

کعبہ کی دیوار میں ایک سیاہ پتھر لگا ہوا ہے جسے حجرِ اَسوَد کہتے ہیں۔ جب اس پتھر کو اپنی جگہ پر رکھنے کا وقت آیا تو قریش میں اس بات کے متعلق جھگڑا ہوگیا کہ حجرِ اَسوَد کون اٹھا کر نصب کرے۔ ہر خاندان کی خواہش تھی کہ ہم اس پتھر کو اٹھا کر اس کی جگہ پر رکھیں۔ آخر یہ رائے ٹھہری کہ اب جو آدمی سب سے پہلے کعبہ میں داخل ہو وہی اپنی رائے سے اس جھگڑے کا فیصلہ کردے اور اس کا فیصلہ ہم سب لوگ دل سے مان لیں گے۔

---

[1] ابن كثير،البداية والنهاية :۸٦/۳، ابن الأثير، الكامل :۳۹/۲، الدياربكري ، تاريخ الخميس:۲٦٤/۱، ابن الجوزي، الوفا بأحوال المصطفى :۱۱۷/۱

[2] مسند أحمد: ۱۵۵۵۹

خدا کا کرنا دیکھو کہ اس وقت جو آدمی سب سے پہلے کعبہ میں آیا وہ حضرت رسولِ اکرم ﷺ تھے۔ آپ ﷺ کو دیکھ کر سب لوگ خوش ہوگئے اور کہنے لگے کہ آپ ﷺ امین ہیں، ہم آپ ﷺ کا فیصلہ بخوشی قبول کریں گے۔

آپ ﷺ نے اس پتھر کو اپنی چادر میں رکھا اور ہر خاندان کے سردار کو کہا کہ وہ اس چادر کے ایک ایک کونے کو تھام لے اور سب مل کر چادر اوپر کو اٹھائیں۔ چنانچہ سب نے مل کر چادر کو اوپر اٹھایا۔ جب پتھر اپنی جگہ پر آگیا تو آپ ﷺ نے اپنے مبارک ہاتھوں سے پتھر کو اٹھا کر اس کی جگہ پر رکھ دیا۔ اس طرح یہ جھگڑا حضرت رسولِ اکرم ﷺ کی برکت سے ختم ہوگیا اور تلوار چلتے چلتے رہ گئی۔[1]

شرک سے پرہیز

اس زمانے میں عرب کے لوگ بت پُوجتے تھے اور اُن میں ہر قسم کی بُرائیاں موجود تھیں۔ مگر حضرت رسولِ مقبول ﷺ بچپن سے بہت نیک اور اچھے تھے۔ آپ ﷺ ہمیشہ سچ بولتے اور ہر بُرے کام سے بچتے رہے۔ جوانی میں بھی نیک اور پاک رہے۔ آپ ﷺ نے کبھی کسی شخص کو نہ ستایا۔ ہر ایک سے اچھا برتاؤ کیا۔ زندگی بھر بتوں کی پوجا سے بچتے رہے۔ آپ ﷺ مشرکانہ رُسوم سے ہمیشہ دور رہتے تھے۔

آپ ﷺ نے غیر اللہ کے نام پر ذبح کیے ہوئے جانور کا گوشت کبھی نہ کھایا تھا۔[2]

---

[1] ابن كثير ، البداية والنهاية : ٩٤/٣ ، ابن الأثير ، الكامل :٤٢/٢ ، ابن سعد ، الطبقات الكبرى: ١٤٥/١ ، المقريزي، إمتاع الأسماع :١٩/١ ، البيهقي ، دلائل النبوة :٥٧/٢ ، المستدرك للحاكم: ١٧٢٦، الطبراني، المعجم الأوسط : ٢٤٤٢

[2] صحيح البخاري :٣٨٢٦، البيهقي ، دلائل النبوة :٣٠/٢ ، الذهبي، تاريخ الإسلام :٦٢/١ ، ابن الجوزي ، الوفا بأحوال المصطفى :١١٣/١

دوسرا باب

آنحضرت ﷺ کی بعثت

سال پر سال گزرتے چلے گئے۔ حضرت رسولِ اکرم ﷺ تجارتی کاروبار میں برابر مصروف رہے۔ کاروبار میں آپ ﷺ کی نیک نامی، دیانتداری، صدق و امانت اور معاملے کی صفائی نے آپ ﷺ کی شہرت کو چار چاند لگا دیے۔

نکاح کے بعد آنحضرت ﷺ فارغ البال اور مالدار ہو گئے تھے۔ آپ ﷺ اپنی دولت غریبوں اور محتاجوں کی امداد و اِعانت میں صَرف کرتے اور فراغت کے اوقات ذکرِ الٰہی اور فکرِ معاد میں گزارتے تھے۔

خلوت پسندی

حضرت رسولِ اکرم ﷺ بعثت یعنی پیغمبر ہونے سے پہلے اکیلا رہنا پسند فرماتے تھے۔ آپ ﷺ تنہائی میں بیٹھ کر اللہ کو یاد کیا کرتے اور اس دنیا کے متعلق غور و فکر فرمایا کرتے تھے۔ شہر مکہ کے قریب ایک پہاڑ کی کھوہ تھی جس کو غارِ حرا کہتے ہیں۔ حضرت رسولِ اکرم ﷺ لوگوں سے الگ رہنے کے لیے اس غار میں جا بیٹھتے۔ کئی کئی دنوں کا کھانا ساتھ لے جاتے اور دنیا کا تمام کاروبار چھوڑ کر رات دن ذکرِ الٰہی میں مشغول رہتے تھے اور اسی غار میں بیٹھ کر اپنی قوم اور ساری دنیا کی حالت کے متعلق سوچا کرتے تھے۔[1]

آغازِ نبوّت

جب حضرت رسولِ اکرم ﷺ کی عمر چالیس برس کی ہوئی تو غارِ حرا میں آفتابِ نبوّت

[1] صحيح البخاري :٣، ابن كثير، البداية والنهاية :١٨٧/٣ ، تاريخ الطبري:٢٩٨/٢، الذهبي ، تاريخ الإسلام: ٦٥/١

طلوع ہوا اور تاجِ رسالت آپ ﷺ کے سرِ مبارک پر رکھ کر پیغمبری سے سرفراز کیا گیا۔ نبوّت کا آغاز سچے خوابوں سے ہوا۔ آپ ﷺ جو خواب دیکھتے وہ سچا نکلتا۔ برابر چھ ماہ تک حضرت رسولِ اکرم ﷺ کو سچے خواب نظر آتے رہے۔ اس کے بعد رسالت و نبوّت کی ذمہ داریاں آپ ﷺ کو سونپی گئیں۔[1]

غارِ حرا میں پہلی وحی

۱۷ رمضان المبارک کا ذکر ہے کہ حضرت رسولِ اکرم ﷺ حسبِ عادت غارِ حرا میں ذکرِ الٰہی میں مشغول تھے کہ اچانک حضرت جبرائیل علیہ السلام آئے۔ حضرت جبرائیل علیہ السلام وہ فرشتہ ہیں جو پیغمبروں کے پاس خدا کا پیغام لے جانے پر مقرر تھے۔ حضرت جبرائیل علیہ السلام نے کہا: ''پڑھیے'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''میں پڑھنا نہیں جانتا۔'' پھر حضرت جبرائیل علیہ السلام نے حضرت رسولِ اکرم ﷺ کو بڑے زور سے دبایا اور کہا: پڑھیے۔ آپ ﷺ نے پھر فرمایا کہ ''میں پڑھنا نہیں جانتا۔'' حضرت جبرائیل علیہ السلام نے اس طرح تین دفعہ آپ ﷺ کو زور سے دبانے کے بعد کہا:

﴿ اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ ﴾[2]

''اپنے اُس خدا کا نام لے کر پڑھیے جس نے کائنات کو پیدا کیا۔''

یہ پہلی وحی تھی جو حضرت رسولِ مقبول ﷺ پر نازل ہوئی۔

اس وحی کا آنا تھا کہ حضرت رسولِ اکرم ﷺ پر اپنی اُمت کی تعلیم کا بڑا بوجھ ڈال دیا گیا۔ آپ ﷺ ڈر گئے، دل کانپ گیا۔ فوراً گھر واپس آئے اور حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے کہا کہ ''مجھے کمبل پہناؤ۔'' اُنھوں نے آپ ﷺ پر کمبل ڈال دیا۔ جب ذرا سکون ہوا تو آپ ﷺ نے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے سارا ماجرا بیان کیا۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے

---

[1] صحیح البخاري:۳، صحیح مسلم: ۱٦۰، مسند أحمد: ۲۵۲۰۲

[2] العلق: ۹٦/۱

آپ ﷺ کو تسلی دی اور کہا کہ: آپ تو صلہ رحمی کرتے ہیں۔ غریبوں، محتاجوں اور بے کسوں پر رحم فرماتے ہیں۔ مسکینوں کے کام آتے ہیں اور حق کے معاملات میں مظلوموں کی حمایت کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو ہرگز نقصان نہیں پہنچنے دے گا۔

پھر حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا رسولِ اکرم ﷺ کو اپنے چچیرے بھائی وَرَقَہ بن نَوفَل کے پاس لے گئیں۔ ورقہ بن نوفل بڑا عالم فاضل آدمی تھا اور تورات خوب جانتا تھا۔ اس نے سارا واقعہ سن کر کہا کہ یہ وہی فرشتہ ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر اُترا تھا۔ پھر کہا: اے کاش! میں اس وقت طاقتور اور تندرست ہوتا جب آپ کی قوم آپ کو گھر سے نکال دے گی۔ حضرت رسولِ اکرم ﷺ نے پوچھا: ''کیا ایسا ہوگا؟'' وَرَقَہ نے کہا کہ آپ سے پہلے جو بھی اس قسم کا پیغام لے کر آئے ان کی قوم نے ایسا ہی کیا۔[1]

تبلیغ کی ابتداء

تھوڑے عرصے کے بعد حضرت رسولِ اَکرم ﷺ کو اللہ کی طرف سے حُکم ملا کہ آپ اپنے خاندان اور اپنی قوم کو بت پرستی سے روکیں اور دینِ اِسلام کی ہدایت کریں۔ چنانچہ حضرت رسولِ اَکرم ﷺ نے پہلے پہل لوگوں کو چپکے چپکے اِسلام کا پیغام سنانا شروع کیا۔[2]

توحید

یہ دینِ اِسلام کا بنیادی عقیدہ ہے۔ توحید کا مطلب یہ ہے کہ اللہ ایک ہے۔ اس کا کوئی شریک اور ساجھی نہیں۔ اسی نے سب چیزوں کو پیدا کیا۔ اسی نے زمین بنائی، آسمان بنایا۔ وہی مینہ برساتا اور ہوا چلاتا ہے۔ وہی اولاد دیتا ہے۔ وہی پھل پھول اور اَناج اُگاتا ہے۔

---

[1] صحیح البخاري: ۳، ۴۹۵۳، صحیح مسلم: ۱۶۰، ابن کثیر، البدایة والنهایة: ۳/۱۸۷

[2] الشعراء: ۲۶/۲۱۴، ابن سعد، الطبقات الکبریٰ: ۱/۱۹۹، ابن الأثیر، الکامل: ۲/۶۰، ابن کثیر، البدایة و النهایة: ۳/۲۴۰۔

وہی زندہ رکھتا ہے اور وہی مارتا ہے۔ سب اس کے محتاج ہیں، وہ کسی کا محتاج نہیں۔[1]

پہلے مسلمان

حضرت رسولِ اکرم ﷺ پر عورتوں میں سب سے پہلے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا ایمان لائیں۔ مردوں میں حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ ایمان لائے۔ لڑکوں میں حضرت علی رضی اللہ عنہ۔ آزاد کیے ہوئے غلاموں میں حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ اور غلاموں میں حضرت بلال رضی اللہ عنہ ایمان لائے تھے۔ اس کے بعد کچھ اور لوگ ایمان لائے۔[2]

تین برس تک حضرت رسولِ اکرم ﷺ چپکے چپکے لوگوں کو ایک خدا کی طرف بلاتے رہے۔ جو لوگ نیک اور سمجھ دار تھے اُنھوں نے اِسلام قبول کر لیا۔ آپ ﷺ کے سمجھانے پر حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ، حضرت زبیر بن عوّام رضی اللہ عنہ، حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ اور چند دوسرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم حضرت رسولِ اکرم ﷺ پر ایمان لے آئے۔[3] دیگر ایمان لانے والے حضرات میں حضرت ابو ذر غفاری، عمّار، خبّاب، اَرقم، سعید بن زید اور صُہیب رضی اللہ عنہم خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔[4]

---

[1] الموسوعة العربية الميسرة: ۱/۱۰۵۱، مزید دیکھیے محمد بن عبدالوہاب رحمہ اللہ کی کتاب ''کتاب التوحید'' اسی طرح شاہ ولی اللہ کے پوتے شاہ اسماعیل شہید رحمہ اللہ کی تصنیف ''تقویۃ الایمان''

[2] مسند أحمد: ۳۸۳۲، ابن كثير، البداية والنهاية: ۳/۲۲۲-۲۲۳، ابن الأثير، الكامل: ۲/۵۷، ابن إسحاق، السيرة النبوية، ص: ۱۸۶

[3] ابن الأثير، الكامل: ۲/۵۹، ابن إسحاق، السيرة النبوية، ص: ۱۸۴، ابن هشام، السيرة النبوية: ۱/۲۵۰۔ نوٹ: یہ تمام صحابہ سیدنا حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر اِسلام لائے تھے۔ آپ انھیں رسول اللہ ﷺ کے پاس لے کر آئے تو آپ ﷺ نے ان کے قلوب واذہان کو مزید نورِ ایمان سے منور کیا۔

[4] سنن ابن ماجه: ۱۴۹-۱۵۰، مسند أحمد: ۳۸۳۲، الشوكاني، درالصحابة، ص: ۲۵۷-۲۵۹، ۳۶۸، ابن حجر، الإصابة: ۱/۹۱، ابن إسحاق، السيرة النبوية، ص: ۱۸۶، ابن كثير، البداية والنهاية: ۳/۲۲۰

حضرت اَرقم رضی اللہ عنہ کے گھر کو پہلا دارالتبلیغ اور اشاعتِ اسلام کا مرکز بنایا گیا۔[1]

علانیہ تبلیغ

اب حضرت رسولِ اکرم ﷺ کو خدا کی طرف سے حکم ملا کہ آپ اپنے قریبی رشتہ داروں کو ڈراؤ اور نڈر ہو کر کھلے بندوں ایک خدا کی طرف لوگوں کو بلاؤ۔[2] یہ حکم ملتے ہی آنحضرت ﷺ نے کھلم کھلا بتوں کی پوجا سے روکنا شروع کیا۔ قریش مکہ ایک خدا کا نام سن کر بڑے سٹپٹائے اور جب اُنھوں نے دیکھا کہ آنحضرت ﷺ بتوں کی پوجا سے روکتے ہیں تو وہ آپ ﷺ کے دشمن بن گئے۔[3]

جو شخص حضرت رسولِ اکرم ﷺ پر ایمان لے آتا قریش مکہ اس پر بڑی سختی کرتے۔ کمزور اور غریب مسلمانوں کو طرح طرح کے عذاب دیتے۔ کسی مسلمان کو تو قید و بند کے ذریعے تکلیف پہنچاتے۔ کسی کو بھوکا پیاسا رکھ کر ستاتے۔ کسی کو دوپہر کی گرمی میں تپتی ہوئی ریت پر لٹا کر سزا دیتے تھے۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ لوگ کسی طرح اِسلام کو چھوڑ دیں۔ لیکن مسلمان بڑی بڑی تکلیفیں اٹھاتے اور ہر قسم کا دُکھ برداشت کرتے، مگر حضرت رسولِ اکرم ﷺ کا ساتھ نہ چھوڑتے۔[4]

آنحضرت ﷺ قریش کی دشمنی کو خاطر میں نہ لائے۔ آپ ﷺ نے بڑی بے باکی اور جراَت وہمت سے لوگوں کو خدا کا حکم سنایا۔ ایک خدا کی طرف بلایا اور بتوں کی پوجا سے منع کیا۔ تبلیغ حق کی خاطر آپ ﷺ نے بڑے جتن کیے۔ ایک دفعہ آپ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف سے قریش کے سرداروں کو کھانے پر بلایا۔ کھانے کے بعد حضرت رسولِ اکرم ﷺ نے سردارانِ قریش کو اِسلام کی دعوت دی۔[5]

---

1. ابن حجر، الإصابة : ۹۲/۱، الأزرقي، أخبار مكة : ۲۰۰/۲
2. الشعراء : ۲۱٤/۲٦، ابن الأثير، الكامل :۶۰/۲، ابن كثير، البداية والنهاية: ٤۰/۳
3. صحيح البخاري : ٤۷۷۰، صحيح مسلم : ۲۰۸، ابن إسحاق، السيرة النبوية، ص: ۲۲٦
4. سنن ابن ماجه: ۱٤۹، مسند أحمد :۳۸۳۲، ابن كثير، البداية والنهاية :۲٦۸/۳
5. البيهقي، دلائل النبوة :۱۷۹/۱، ابن الجوزي، الوفا بأحوال المصطفى:۱٤۷/۱

ایک مرتبہ حضرت رسولِ اکرم ﷺ نے صفا پہاڑی پر کھڑے ہو کر قریش کو پکارا تو آپ ﷺ کی آواز سُن کر قریش کے بڑے بڑے سردار اس پہاڑی کے نیچے آکر جمع ہو گئے۔ حضرت رسولِ اکرم ﷺ نے ان سے پوچھا: ''اگر میں تم سے یہ کہوں کہ اس پہاڑ کے پیچھے تمھارے دشمنوں کا ایک لشکرِ جرّار جمع ہے جو تم پر حملہ کرنے والا ہے تو کیا تم میری بات پر یقین کر لو گے؟'' سب نے ہم آواز ہو کر کہا: ہاں! بے شک، کیونکہ آپ نے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔

پھر حضرت رسولِ مقبول ﷺ نے فرمایا کہ ''اگر تم نے خدا کا پیغام نہ مانا تو تم پر بڑا سخت عذاب نازل ہوگا۔'' یہ سن کر ابولہب بول اٹھا: کیا تم نے یہی سنانے کے لیے ہمیں یہاں بلایا تھا؟ یہ کہنے کے بعد وہ اُٹھ کر چلا گیا۔ قریش کے دوسرے سردار بھی ناراض ہو کر چلے گئے۔[1]

کفار کی ایذا رسانی

جب قریش نے حضرت رسولِ مقبول ﷺ کی زبان سے ایک خدا کا نام سنا تو بہت بگڑے۔ بتوں کی پوجا سے روکنے پر وہ آپ ﷺ کے دشمن بن گئے۔ کفار نے آنحضرت ﷺ کو بڑی سخت تکلیفیں پہنچائیں اور طرح طرح سے ستایا۔ آپ ﷺ کی راہ میں کانٹے بچھائے۔[2] پتھر مار مار کر لہولہان کر دیا۔[3] غریب اور بے کس مسلمانوں کو بہت دُکھ دیے۔ رَسّی سے باندھ کر انھیں پیٹتے۔[4] دوپہر کے وقت گرم ریت پر لٹا دیتے۔[5] بعض مسلمان

---

[1] صحيح البخاري: ٤٧٧٠، ٤٩٧١-٤٩٧٢، صحيح مسلم: ٢٠٨، ابن كثير، البداية والنهاية: ٢٤٠/٣، ابن سيد الناس، عيون الأثر: ١٠٠/١، ابن الجوزي، الوفا بأحوال المصطفى: ١٤٦/١

[2] ابن هشام، السيرة النبوية: ٣٥٦/١

[3] البلاذري، أنساب الأشراف: ٢٧٣/١

[4] سنن ابن ماجه: ١٥٠، مسند أحمد: ٣٨٣٢

[5] البلاذري، أنساب الأشراف: ٢١٠/١

مردوں اور عورتوں کو نیزے مار کر شہید کر دیا۔[1] آنحضرت ﷺ ان تمام تکالیف و مصائب کو برداشت کرتے اور خدا کا حکم برابر سناتے رہے۔ تبلیغِ دین میں آپ ﷺ نے جس جوانمردی، جرأت و ہمت اور استقلال و استقامت کا ثبوت دیا وہ مندرجہ ذیل واقعات سے ظاہر ہے:

اکثر اوقات کفار مکہ حضرت رسولِ اکرم ﷺ کے راستے میں کانٹے بچھا دیتے تھے تاکہ رات کے وقت اندھیرے میں آپ ﷺ کے پاؤں زخمی ہو جائیں۔[2] قریش کے بدبخت لوگ آپ ﷺ کے گھر کے دروازے پر گندگی پھینک جاتے تھے تاکہ آپ ﷺ کی صحت خراب اور دل پریشان ہو۔[3]

ایک دن آنحضرت ﷺ خانہ کعبہ میں نماز پڑھ رہے تھے ایک شخص عُقبہ بن ابی مُعَیط آیا، اس نے اپنی چادر کو بل دیے اور جب آنحضرت ﷺ سجدے میں گئے تو اس نے چادر کو آپ ﷺ کی گردن میں ڈال کر اتنے پیچ دیے کہ آپ ﷺ کا گلا گھٹنے لگا۔ حضرت رسولِ اکرم ﷺ تکلیف کے باوجود پورے اطمینان سے سجدے میں پڑے ہوئے تھے کہ اتنے میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ آئے اور اُنھوں نے دَھکے دے کر عُقبہ کو ہٹا دیا۔[4]

ایک دن حضرت رسولِ اکرم ﷺ خانہ کعبہ میں نماز پڑھنے گئے، قریش بھی وہاں جا پہنچے۔ بدبخت عقبہ گیا اور اُونٹ کی اوجھڑی اٹھا لایا۔ جب آپ ﷺ سجدے میں گئے تو اس نے اوجھڑی آپ ﷺ کی پیٹھ مبارک پر رکھ دی۔ آپ ﷺ کی پیاری بیٹی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا آگئیں اور اُنھوں نے اوجھڑی کو پرے پھینک دیا۔[5]

جب کفار مکہ کی تمام شرارتیں بے سود ثابت ہوئیں تو وہ ہنسی اُڑانے پر اُتر آئے۔ اُنھوں

---

[1] البلاذري، أنساب الأشراف: ١٨٢/١، ابن كثير، البداية والنهاية: ٢٦٨/٣

[2] ابن هشام، السيرة النبوية: ٢٥٥/١

[3] ابن سعد، الطبقات الكبرىٰ: ٢٠١/١، ابن الأثير، الكامل: ٧٠/٢-٧٤

[4] صحيح البخاري: ٣٨٥٦، مسند أحمد: ٦٩٠٨

[5] صحيح البخاري: ٢٤٠ - ٥٢٠، صحيح مسلم: ١٧٩٤

نے رسولِ اکرم ﷺ کو تنگ کرنے اور ستانے کے لیے باقاعدہ انجمن بنائی اور ہنسی مذاق سے تکلیف پہنچانے لگے۔ کفار آپ ﷺ پر آوازے کستے، ٹھٹھا مخول کرتے، لیکن حضرت رسولِ اکرم ﷺ سب کچھ برداشت کرتے اور ایک اللہ کی طرف برابر بلاتے رہے۔[1]

قریش نے دیکھا کہ آنحضرت ﷺ اور آپ ﷺ کے ساتھی تکلیفوں کو صبر کے ساتھ برداشت کرتے ہیں اور سچی بات کہنے سے باز نہیں آتے تو ایک دن قریش کے سردار اکٹھے ہوکر آپ کے چچا ابو طالب کے پاس گئے اور کہنے لگے کہ تم اپنے بھتیجے کو سمجھا دو کہ وہ ہمارے بُتوں کو بُرا کہنا چھوڑ دے، ورنہ پھر ہماری تمھاری لڑائی ہے۔ سردارانِ قریش یہ بات کہہ کر واپس چلے آئے۔ ابو طالب نے حضرت رسولِ اکرم ﷺ کو بلا کر سارا قصہ سنایا۔ آپ ﷺ نے جواب دیا:

''چچا جان! خدا کی قسم! اگر یہ لوگ میرے ایک ہاتھ پر سورج اور دوسرے ہاتھ پر چاند بھی رکھ دیں تو میں اپنے کام سے باز نہ آؤں گا۔''

جب ابو طالب نے یہ سنا تو کہا: اے بھتیجے! تم اپنا کام کیے جاؤ، میں تمھارا ساتھ کبھی نہیں چھوڑوں گا۔[2]

اس کے بعد قریش نے ایک اور داؤ چلایا۔ وہ ایک شخص عمارہ بن ولید بن مغیرہ کو لے کر ابوطالب کے پاس گئے اور کہنے لگے: دیکھو، یہ عمارہ ہے جو قریش میں سب سے زیادہ بہادر، جوانمرد اور حسین ہے۔ اے ابوطالب! تم اسے اپنا بیٹا بنالو۔ اس کی عقل وخرد اور طاقت وقوت تمھارے کام آئے گی اور اپنے بھتیجے (حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ) کو ہمارے سپرد کردو۔ تمھارا یہ بھتیجا ہمارے اور تمھارے آبائی دین کی مخالفت کرتا ہے۔ اس نے ہماری قوم میں افتراق پیدا کردیا ہے اور ہمارے عقلمندوں کو بت پوجنے کی وجہ سے بے وقوف ٹھہراتا ہے۔ تم آدمی کے بدلے آدمی لے لو، ہم اسے قتل کردیں گے۔

---

[1] ابن هشام، السيرة النبوية: ۲۸۹/۱

[2] ابن الجوزي، الوفا بأحوال المصطفى: ۱۵۲/۱، ابن كثير، البداية والنهاية: ۲۵۳/۳، السهيلي، الروض الأنف: ۸/۲، ابن سيد الناس، عيون الأثر: ۹۹/۱، ابن إسحاق، السيرة النبوية، ص: ۱۹۶

ابو طالب نے کہا: یہ تو بڑا بُرا سودا ہے۔ کیا میں اپنا بیٹا اس لیے تمھارے حوالے کر دوں کہ تم اسے قتل کر دو اور تمھارا بیٹا اس لیے لے لوں کہ اسے پال پوس کر پھر تمھارے حوالے کر دوں؟ [1]

قریش نے حضرت رسولِ اکرم ﷺ اور مسلمانوں کو دُکھ دیے اور تکلیفیں پہنچائیں، مگر جب ستانے سے کام نہ چلا تو دھمکیوں پر اُتر آئے۔ جب دھمکیوں کا بھی کوئی اثر نہ ہوا تو قریش نے سوچا کہ لالچ دینا چاہیے، شاید آپ ﷺ لالچ میں آجائیں۔ اس غرض کے لیے قریش نے اپنے ایک سردار عُتبہ کو آنحضرت ﷺ کے پاس بھیجا۔ اس نے آپ ﷺ سے کہا: اگر آپ مکے کا بادشاہ بننا چاہتے ہیں تو ہم آپ کو بادشاہ بنانے کے لیے تیار ہیں۔ اگر آپ مال و دولت چاہتے ہیں تو ہم آپ کے سامنے مال و دولت کے انبار لگا سکتے ہیں۔ آپ جو مانگیں ہم دینے کو تیار ہیں۔ آپ ہمارے بتوں کو بُرا کہنا چھوڑ دیں۔

اس کے جواب میں حضرت رسولِ اکرم ﷺ نے فرمایا: ''تمھارا معبود صرف ایک اللہ ہے۔ اسی کی عبادت کرو۔ اس کا کوئی شریک اور ساجھی نہ ٹھہراؤ۔ وہی سارے جہان کا مالک اور پالن ہار ہے۔'' [2]

جب قریش کا یہ داؤ بھی ناکام رہا تو وہ بڑے شرمندہ ہوئے۔ آخر ایک دن قریش مکہ نے ولید بن مغیرہ کے مکان پر جمع ہو کر مشورہ کیا کہ حج کا موسم آ رہا ہے۔ لوگ باہر سے بیت اللہ شریف کی زیارت کے لیے آئیں گے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ پردیسی لوگ ان کا پیغام سُن کر ان کے ساتھ ہو جائیں۔ ولید بن مغیرہ نے کہا کہ بات طے کر لو اور پھر سب ڈٹ کر اس پر عمل کرو۔

قریش نے کہا: ہم حاجیوں کو کہہ دیں گے کہ یہ شخص کاہن ہے۔ ولید بن مغیرہ بولا: ہم خوب جانتے ہیں کہ کاہن اور کہانت کیا چیز ہے۔ یہ شخص کاہن نہیں۔ پھر قریش نے

---

[1] ابن كثير، البداية والنهاية: ٢٥٤/٣، السهيلي، الروض الأنف: ٥/٢، ابن سيد الناس، عيون الأثر: ١٠٠/١

[2] الهندي، كنز العمال: ٣٥٤٢٨، ابن كثير، البداية والنهاية: ٢٥٧/٣، السهيلي، الروض الأنف: ٣٦/٢

کہا: ہم کہہ دیں گے کہ یہ شخص مجنوں ودیوانہ ہے۔ ولید کہنے لگا: دیوانگی اور جنون کو ہم خوب سمجھتے ہیں۔ یہ دیوانہ بھی نہیں۔ یہ سن کر قریش بولے: ہم کہیں گے کہ یہ شخص شاعر ہے۔ ولید بن مغیرہ نے کہا: ہم جانتے ہیں کہ شعر و شاعری کیا چیز ہے۔ یہ شخص شاعر بھی نہیں ہے۔ آخر قریش نے ولید سے پوچھا کہ تم ہی بتاؤ کہ ہم کیا کہیں؟ اس نے جواب دیا کہ اس شخص کے کلام میں شیرینی اور حلاوت ہے جو دلوں کو موہ لیتی ہے۔ اس کی بات میں تاثیر ہے جو کانوں کی راہ سے دل میں اتر جاتی ہے۔ بہتر یہی ہے کہ تم کہو: ساحر ہے جو باپ بیٹے، میاں بیوی اور بھائی بھائی میں جدائی اور افتراق ڈال دیتا ہے۔[1]

آخر یہی رائے ٹھہری اور اس فیصلے کے مطابق قریش زائرین بیت اللہ کو کہنے لگے کہ یہ شخص ساحر اور جادوگر ہے، اس کی بات نہ سُنیے۔ مگر اللہ تعالیٰ کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ آپ ﷺ کی آواز زائرین بیت اللہ کے ذریعے دور دور علاقوں میں پہنچنے لگی۔

ہجرت حَبَش

قریش مکہ نے حضرت رسولِ اکرم ﷺ کو ستایا، دھمکایا، لالچ دیا اور جب کوئی داؤ نہ چل سکا تو غریب مسلمانوں پر اور زیادہ سختی شروع کردی۔ جب آپ ﷺ نے دیکھا کہ اب مسلمانوں کے لیے مکّہ مکرّمہ میں رہنا دشوار ہوگیا ہے تو آپ ﷺ نے مسلمانوں کو اجازت دے دی کہ وہ ملک حبش کو چلے جائیں اور فرمایا کہ ''وہاں ایک بادشاہ ہے جس کے ہاں لوگوں پر ظلم نہیں ہوتا۔ اس کا ملک راست بازی اور صدق کی سرزمین ہے۔''[2] آپ ﷺ کی اجازت پا کر نبوّت کے پانچویں سال بارہ مردوں اور چار عورتوں نے کشتی میں سوار ہوکر حبش کو ہجرت کی۔[3] بعد میں اور مسلمان بھی وہاں جا پہنچے۔ اب ان کی تعداد علاوہ بچوں کے ۸۳ مردوں اور

---

[1] ابن الأثير، الكامل: ۷۱/۲ ، جواد علي، المفصل: ۱۳۳/۹ ، ابن كثير، البداية والنهاية: ۲۷۵/۳

[2] مصنف عبدالرزاق: ۳۸٤/٥، ابن سعد، الطبقات الكبرىٰ: ۲۰۳/۱ ، البيهقي، دلائل النبوة: ۳۰۱/۲

[3] ابن حجر، فتح الباري: ۱۸۸/۷، تاريخ الطبري: ۳۲۹/۲

۷ اعورتوں تک پہنچ گئی۔[1] حبش کا عیسائی بادشاہ نجاشی ایک نیک دل اور عادل حکمران تھا۔ اس نے مسلمانوں سے بڑا اچھا سلوک کیا۔ نجاشی کے ملک میں مسلمانوں کو امن و سلامتی اور سکھ چین کی زندگی نصیب ہوئی۔[2]

ان مہاجرین میں حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ، آپ کی بیوی حضرت رُقیّہ رضی اللہ عنہا بنتِ رسولِ خدا ﷺ، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ، حضرت زُبیر بن عوام رضی اللہ عنہ اور حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ اور آپ کی بیوی حضرت اسماء رضی اللہ عنہا بھی شامل تھیں۔[3]

جب قریش نے دیکھا کہ حبش میں مسلمانوں کو آرام و اطمینان سے رہنے کا موقع مل گیا ہے تو انھیں بڑا رنج و قلق ہوا اور وہ بے چین ہو گئے۔ اُنھوں نے فوراً مجلسِ مشاورت بلائی اور فیصلہ کیا کہ دو مضبوط و مقتدر آدمی نجاشی کے دربار میں جائیں اور کسی نہ کسی طرح وہاں سے مسلمانوں کو نکلوا دیں۔

اس مقصد کے پیشِ نظر عمرو بن العاص اور عبداللہ بن ابی ربیعہ کو قریش کا نمائندہ بنا کر نجاشی کی خدمت میں بھیجا گیا۔ قریش کے یہ دونوں نمائندے تحفے تحائف لے کر نجاشی کے دربار میں حاضر ہوئے اور رسمی ملاقات اور نذرانے و تحفے پیش کرنے کے بعد نجاشی کی خدمت میں یہ عرضداشت پیش کی:

> ”اے بادشاہ سلامت! ہمارے چند بے وقوف نوجوانوں نے اپنا وطن چھوڑ کر آپ کے ملک میں پناہ لی ہے۔ ان لوگوں نے اپنی قوم کا مذہب ترک کر کے حضور والا کا مذہب اختیار نہیں کیا، بلکہ ایک ایسا نیا مذہب اختیار کیا ہے جس سے نہ حضور والا آشنا ہیں اور نہ ہم اس سے آگاہ ہیں۔ ہم نے جناب والا کی قدم بوسی کا شرف اس لیے حاصل کیا ہے کہ

---

[1] الفاسي، نفائس الدرر: ۲۴۸/۱، ابن هشام، السيرة النبوية: ۳۳۰/۱، ابن كثير، البداية والنهاية ۲۸۱/۳، ۲۸۵:

[2] مسند أحمد: ۱۷۴۹

[3] ابن حجر، فتح الباري: ۱۸۸/۷، ابن الجوزي، الوفا بأحوال المصطفى: ۱۵۴/۱

آپ ان لوگوں کو ہمارے حوالے کر دیں۔ ان میں قریش کے شرفاء کی اولاد بھی شامل ہے۔ان نوجوانوں نے مذہب تبدیل کر کے قریش کی ناک کاٹ ڈالی ہے۔''

نجاشی کے درباری عرض پرداز ہوئے : اے بادشاہ سلامت! اگر ان لوگوں کو ان کے سپرد کر دیا جائے تو یہ انھیں اپنے وطن اور قوم میں پہنچا دیں گے۔

نجاشی بڑا سمجھ دار، انصاف پسند اور دُور بین بادشاہ تھا۔ اس نے مسلمان مہاجرین کو طلب کر کے ان کے مذہب کے بارے میں دریافت کیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بھائی حضرت جعفر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا:

''اے بادشاہ سلامت! ہم لوگ جاہل تھے، بُت پوجتے تھے، مردار کھاتے تھے اور ہر قسم کی بُرائی کا ارتکاب کرتے تھے۔ ہمسائے کو ستاتے تھے۔ طاقتور کمزور کو مارتا تھا۔ آخر خدا نے ہم میں سے ایک آدمی کو رسول بنا کر بھیجا۔ ہم اس کے باپ دادا سے خوب واقف ہیں اور اس کی دیانتداری، صدق و امانت اور نیکی کو اچھی طرح جانتے ہیں۔اس رسول ﷺ نے ہم کو ایک خدا کی طرف بلایا اور کہا کہ ہم بتوں کی پوجا چھوڑ دیں، سچ بولیں، بری باتوں سے بچیں، دھوکہ فریب نہ کریں، یتیم کا مال نہ کھائیں، محتاجوں اور غریبوں کی امداد کریں، ایک اللہ کی عبادت کریں۔ ہم نے اس کی باتوں کو مان لیا ہے۔''

پھر نجاشی نے پوچھا: تمھارے پاس پیغامِ خدا میں سے کوئی چیز ہے؟ حضرت جعفر رضی اللہ عنہ نے کہا: ہاں! نجاشی بولا: مجھے پڑھ کر سناؤ۔

حضرت جعفر رضی اللہ عنہ نے سورۂ مریم تلاوت کی۔ اس میں حضرت مریم علیہا السلام کا قصہ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وِلادت کا بیان ہے۔ نجاشی سن کر بڑا متاثر ہوا۔ اس کی آنکھوں سے

اس قدر آنسو ٹپکے کہ داڑھی تر ہوگئی۔ پادریوں پر بھی بڑا اثر ہوا۔ پھر نجاشی کہنے لگا: یہ پیغام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا پیغام دونوں ایک ہی خدا کی طرف سے ہیں۔ پھر قریش کے نمائندوں کو مخاطب کر کے کہا:

''تم دونوں واپس چلے جاؤ۔ خدا کی قسم! میں ان مہاجرین کو تمھارے حوالے نہ کروں گا۔''[1]

مسلمانوں کو نجاشی کے ملک میں امن و چین نصیب ہوا اور قریش منہ کی کھا کر نامُراد لوٹے۔

سیاسی بصیرت

حضرت رسولِ اکرم ﷺ نے اپنے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو ملک حَبَش کی طرف ہجرت کر جانے کی اجازت دینے میں جس سیاسی بصیرت، معاملہ فہمی اور دانشمندی کا ثبوت دیا وہ کسی اہلِ نظر سے پوشیدہ نہیں۔ یہ بات غور طلب ہے کہ آپ ﷺ نے سرزمین حبشہ کو کیوں منتخب فرمایا، حالانکہ جزیرۂ عرب میں بیسیوں قبائل تھے۔ آپ کسی ایک قبیلہ کو پسند کر سکتے تھے لیکن اس میں قریش کا اقتدار اور اثر و رسوخ آڑے آتا تھا۔ یَثرِب و نجران کے علاقوں کو بھی پسند نہ فرمایا، حالانکہ یَثرِب میں یہودی اہلِ کتاب تھے اور نجران میں عیسائی۔ اسی طرح یمن کا علاقہ بھی موجود تھا، مگر آپ ﷺ نے اپنے صحابہ کرام کو وہاں بھیجنا اس لیے مناسب نہ سمجھا کہ یہ علاقہ اہلِ فارس کے زیرِ اثر تھا اور اہل فارس کسی آسمانی دین کے پیرو نہ تھے۔ نیز کسریٰ آپ ﷺ کی جان کے درپے ہوسکتا تھا۔ حیرہ کا علاقہ مکّہ مکرّمہ سے بہت دُور اُفتادہ تھا۔ ملک شام بھی بہت دُور ہونے کی وجہ سے خارج از بحث تھا۔ پھر ان ملکوں سے قریش کے تجارتی تعلقات بھی تھے۔ ہوسکتا تھا کہ غریب مسلمان جو خفیہ طور پر وطن کو خیر باد کہہ کر ایک اجنبی ملک میں آباد ہونے کے لیے جا رہے تھے قریش کے ہاتھوں زیادہ تکلیفیں اٹھاتے۔

---

[1] مسند أحمد: ۱۷٤۰، ۲۲٤۹۸، ابن كثير، البداية والنهاية: ۳/۲۸۱-۲۹۳، ابن الأثير، الكامل: ۲/۷٦-۸۲، ابن هشام، السيرة النبوية: ۱/۳۲۱-۳۳۸

اس کے برعکس حضرت رسولِ اکرم ﷺ کو خوب معلوم تھا کہ نجاشی نیک دل اور عادل بادشاہ ہے۔ کسی قسم کا بیرونی دباؤ اور اقتدار اس کے عدل و انصاف پر اثر انداز نہیں ہو سکتا۔ انھی وجوہات کی بنا پر آپ ﷺ نے فرمایا تھا کہ ملک حبش سرزمینِ صدق ہے اور وہاں کسی پر ظلم نہیں ہوتا۔[1] ہجرت کے لیے ملک حبش کا انتخاب سیاسی بصیرت اور دانش مندی کا بہترین ثبوت تھا۔

اس ہجرت کا ایک سیاسی اثر یہ ہوا کہ سارے عرب میں یہ مشہور ہو گیا کہ چند افراد نے اِسلام قبول کیا تو قریش مکہ نے اُنھیں وطن چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ پھر ان مہاجرین کی بدولت اِسلام کی آواز عرب سے باہر ملکوں میں پہنچنے لگی۔

شِعْبِ ابی طالب میں محصوری

جب قریش کی ساری تدبیریں ناکام رہیں اور ان کے جَور وظلم کے باوجود مسلمانوں کی تعداد روز بروز بڑھتی چلی گئی تو قریش نے حضرت رسولِ خدا ﷺ کو قتل کرنے کے لیے بنو ہاشم اور بالخصوص عبدُ المُطّلِب کے خاندان کے خلاف ایک نیا قدم اٹھایا۔ قریش نے فیصلہ کیا کہ عبدُ المُطّلِب کی اولاد اور بالخصوص خاندانِ نبوّت سے بالکل مقاطعہ کر کے ان کا دانہ پانی بند کر دیا جائے۔ چنانچہ فیصلے کے مطابق عہد نامہ لکھا گیا، جس کی رُو سے یہ قرار پایا:

۱۔ کوئی شخص خاندانِ ہاشم اور اولادِ عبدُ المُطّلِب سے کسی قسم کا لین دین نہ کرے۔

۲۔ کوئی مرد ان دونوں خاندانوں کے ہاں شادی بیاہ نہ کرے۔

۳۔ کوئی شخص ان کو اپنی لڑکی نہ دے۔

۴۔ کوئی ان کے ساتھ تجارتی تعلقات نہ رکھے۔ جب تک یہ لوگ آنحضرت ﷺ کو قتل کرنے کے لیے قریش کے حوالے نہ کر دیں۔

---

[1] مصنف عبدالرزاق: ۳۸٤/۵، ابن سعد، الطبقات الکبری: ۲۰۳/۱، البیهقي، دلائل النبوة: ۳۰۱/۲

یہ عہد نامہ لکھ کر کعبہ شریف میں لٹکا دیا گیا۔

جب حضرت رسولِ مقبول ﷺ کو یہ معلوم ہوا تو آپ ﷺ اپنے سارے خاندان سمیت مکہ مکرمہ کی ایک گھاٹی میں، جس کو شِعبِ ابی طالب کہتے تھے، پناہ گزیں ہو گئے۔ یہ واقعہ نبوت کے ساتویں سال کا ہے۔

قریش تین برس تک اس عہد نامے کی پابندی کرتے رہے اور انھوں نے ہر چند کوشش کی کہ خاندان نبوت کو کوئی چیز نہ پہنچنے پائے۔ پھر بھی خاندانِ نبوت کے کچھ خیر خواہ اور ہمدرد پوشیدہ طور پر تھوڑا بہت ان کو پہنچا آتے تھے۔ تین سال تک یہی حالت رہی۔

آخر کار قریش کے چند افراد کو بنو ہاشم اور بنو مطلب کے حال پر رحم آیا اور انھوں نے تہیہ کر لیا کہ اس عہد نامے کو ختم کر دیا جائے اور خاندانِ نبوت کو شعب ابی طالب سے باہر نکالا جائے۔ ایک شخص زہیر بن اَبی اُمیہ نے لوگوں کو عہد نامہ توڑ دینے پر اُکسایا اور کہا ''اے اہلِ مکہ! کیا ہمیں یہ بات زیب دیتی ہے کہ ہم تو کھائیں، پئیں اور پہنیں اور بنو ہاشم اور بنو مطلب بھوکے ہلاک ہو جائیں؟ اُنھیں خرید و فروخت کی بھی اجازت نہیں۔ بخدا! میں اس وقت تک چین سے نہ بیٹھوں گا جب تک کہ اس غیر منصفانہ اور ظالمانہ عہد نامے کو پھاڑ نہ دوں گا۔''

ابوجہل نے اس کی مخالفت کی لیکن اتنے میں قریش کا ایک سردار مُطعِم بن عدی نامی اٹھا اور عہد نامے کو کعبے سے اُتار کر ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا۔ اس طرح قریش کا یہ ناپاک عہد نامہ ختم ہوا اور خاندانِ نبوت کے افراد تین برس تک مصائب و تکالیف سے دو چار ہونے کے بعد شعبِ ابی طالب سے نکل کر اپنے گھروں کو واپس آئے۔[1]

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا اور ابو طالب کی وفات

نبوت کے دسویں سال یعنی اس واقعہ کے چند ماہ بعد حضرت رسولِ مقبول ﷺ کے

[1] ابن إسحاق، السيرة النبوية، ص:۱۹۸، ابن كثير، البداية والنهاية: ۳/۳۰۵، البيهقي، دلائل النبوة: ۲/۳۱۱-۳۱۵

مہربان چچا ابو طالب کا انتقال ہوا۔ جب تک وہ زندہ رہے آنحضرت ﷺ کی ہر طرح حمایت کرتے رہے۔ پیارے چچا کی وفات کے چند روز بعد آپ ﷺ کی ہمدرد اور غمگسار بیوی حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے بھی وفات پائی۔ ان دونوں کی وفات سے آپ ﷺ کو بڑا صدمہ ہوا۔

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا اور ابو طالب کی وفات کے بعد قریش آپ ﷺ کو اور بھی زیادہ تکلیفیں پہنچانے اور گستاخی و بے ادبی سے پیش آنے لگے۔[1]

سفرِ طائف

ابوطالب کی وفات کے بعد قریش کی شرارتیں حد سے بڑھ گئیں اور بالخصوص ابولہب، عُقبہ بن ابی معیط اور حَکَم بن عاص کی، جو حضرت رسولِ اکرم ﷺ کے پڑوس میں رہتے تھے۔ یہ لوگ آپ ﷺ کو ایذائیں پہنچانے میں پیش پیش تھے اور نماز اور کھانے کے اوقات میں آپ ﷺ پر گندگی اور کوڑا کرکٹ پھینک دیتے تھے تاکہ آپ ﷺ کی صحت خراب ہوجائے اور آپ ﷺ پریشان خاطر نظر آنے لگیں۔[2]

اس ظلم وتعدّی کو دیکھ کر آنحضرت ﷺ نے مناسب سمجھا کہ کوئی اور قبیلہ تلاش کیا جائے جو اسلام کی دعوت کو قبول کرنے کی اہلیت اور استعداد رکھتا ہو۔ چنانچہ آپ ﷺ نے طائف جا کر وہاں کے سرداروں کو اسلام کی طرف بلایا اور توحید کا پیغام سنایا۔ یہ شہر مکہ مکرمہ سے جنوب مشرق کو پچپن میل (۹۰ کلومیٹر) کے فاصلے پر واقع ہے۔ اپنی شادابی کے لیے حجاز بھر میں مشہور ہے۔[3] اس وقت بنوثقیف کا قبیلہ یہاں آباد تھا۔ حضرت رسولِ اکرم ﷺ کا یہ سفر تقریباً مہینے پر مشتمل ہے۔ بیس دن اہل طائف اور گرد و نواح کے لوگوں کو اسلام کی

---

[1] ابن الأثير، الكامل في التاريخ: ۲/ ۹۰، ابن كثير، البداية والنهاية: ۳/۳٦۱۔ ۳۷۳، المقريزي، إمتاع الأسماع: ۱/٤٥، الذهبي، تاريخ الإسلام: ۱/١٤٦۔١٥٣

[2] ابن هشام، السيرة النبوية: ۱/٤١٦

[3] القزويني، آثار البلاد، ص: ۹۷، البكري، معجم ماستعجم: ۲/۸۸٦، البروسوي، أوضح المسالك، ص: ٤٤٧، ياقوت الحموي، معجم البلدان: ٤/۸۔١٢

طرف بلاتے رہے۔[1] مگر ان بدقسمت لوگوں نے آپ ﷺ کی آواز پر کان نہ دھرے بلکہ اُلٹا بے اَدبی سے پیش آئے اور اہلِ مکہ سے زیادہ سنگدل ثابت ہوئے۔ طائف کے شریر لوگوں نے پتھر مار کر حضرت رسولِ اکرم ﷺ کو لہولہان کر دیا لیکن آپ ﷺ نے پھر بھی بڑا صبر و تحمل کیا۔[2]

طائف کے لوگوں کی بدسلوکی دیکھ کر حضرت رسولِ اکرم ﷺ مکے میں واپس تشریف لے آئے۔ مکہ میں داخلہ مُطعِم بن عدی کی حمایت میں ہوا۔ اس نے اپنے بیٹے آپ ﷺ کے ساتھ کر دیے۔ آپ ﷺ نے بیت اللہ شریف میں جا کر طواف کیا اور نماز پڑھی۔ کسی کو کچھ کہنے کی ہمت نہ پڑی۔[3] اس کے بعد آپ ﷺ نے حج کے موسم میں باہر سے آنے والے قبیلوں کو اسلام کی طرف بلانا شروع کیا۔[4]

فرضیّت نمازِ پنجگانہ

نبوّت کے گیارھویں سال اللہ تعالیٰ نے حضرت رسولِ اکرم ﷺ کو آسمانوں کی سیر کرائی۔ اپنی نزدیکی عطا کی اور بڑی بڑی نعمتیں نازل کیں۔ آسمانوں کی اس سیر کو معراج کہتے ہیں۔ ایک رات حضرت جبرائیل علیہ السلام آ کر آنحضرت ﷺ کو بُراق پر سوار کر کے خانہ کعبہ سے مسجد اقصیٰ لے گئے۔ پھر سات آسمانوں کی سیر کی۔ جہاں بہت سے پیغمبروں سے ملاقات بھی ہوئی۔ اسی معراج میں پانچ وقت کی نماز فرض ہوئی تھی۔[5]

مکّے سے باہر اشاعتِ اسلام

طائف کے سفر سے واپس آ کر حضرت رسولِ اکرم ﷺ نے ارادہ فرمایا کہ سب قبیلوں اور خاندان کے لوگوں کو ایک اللہ کی طرف بلایا جائے۔ چنانچہ نبوّت کے گیارھویں سال

---

[1] البلاذري، أنساب الأشراف: ۲۷٤/۱ و الزرقاني، شرح المواهب: ۵۰/۲

[2] ابن كثير، الفصول في سيرة الرسول ﷺ، ص: ۱۰۵ ، ابن سيد الناس، عيون الأثر: ۱۳٤/۱ ، ابن كثير، البداية والنهاية: ۳۸۱/۳

[3] الزركلي ، الأعلام: ۲۵۲/۷

[4] ابن هشام، السيرة النبوية: ۷۲۲/۱، ابن كثير، الفصول في سيرة الرسول ﷺ، ص: ۱۰۷

[5] صحيح البخاري: ۳٤۹ ، ۳۸۸۷، صحيح مسلم: ۱٦۳

آپ ﷺ نے عربوں کے میلوں میں تشریف لے جانا شروع کیا۔ میلوں کے علاوہ موسم حج میں بھی آپ ﷺ مختلف خاندانوں کو دینِ اسلام کی ہدایت فرماتے تھے۔[1]

اِسلام یَثرِب میں

اسی سال حج کے موسم میں یَثرِب کے کچھ لوگ مکہ میں آئے۔ یَثرِب کا شہر مکہ مکرمہ سے ۲۷۰ میل (۴۴۰ کلومیٹر) کے فاصلے پر ہے۔ یَثرِب کو اب مدینہ شریف کہتے ہیں۔ حضرت رسولِ اکرم ﷺ ان لوگوں سے بھی ملے اور انھیں اِسلام کی ہدایت فرمائی۔ ان میں سے چھ آدمی مسلمان ہوگئے۔ جب یہ لوگ وطن واپس گئے تو اِسلام کا پیغام دوسرے لوگوں تک پہنچایا۔ اب یَثرِب میں حضرت رسولِ اکرم ﷺ کا چرچا ہونے لگا۔[2]

بیعتِ عَقَبَہٗ اُولیٰ

دوسرے سال ۱۲ نبوت کو حج کے موقع پر یَثرِب کے بارہ آدمی آکر آنحضرت ﷺ سے ملے اور مسلمان ہوگئے۔ ان لوگوں نے آپ ﷺ سے وعدہ کیا کہ

۱۔ ہم ایک خدا کی عبادت کیا کریں گے اور کسی کو اس کا شریک اور ساجھی نہ بنائیں گے۔

۲۔ ہم چوری اور بدکاری نہیں کریں گے۔

۳۔ ہم اپنی اولاد یعنی لڑکیوں کو قتل نہیں کریں گے۔

۴۔ ہم کسی پر جھوٹی تہمت نہیں لگائیں گے اور نہ کسی کی چغلی کھائیں گے۔

۵۔ ہم نبی ﷺ کی فرمانبرداری اور اطاعت کیا کریں گے۔[3]

---

[1] سنن أبي داود: ٤٧٣٤، سنن ابن ماجه: ٢٠١، الذهبي، تاريخ الإسلام: ١٨٣/١، ابن كثير، البداية والنهاية: ٣٨٥/٣، ابن هشام، السيرة النبوية: ٤٢٢/١

[2] البيهقي، دلائل النبوة: ٤٢٠/٢، ابن كثير، البداية والنهاية: ٤٩٦/٣

[3] صحيح البخاري: ١٨

اس پختہ وعدہ کو بیعت کہتے ہیں۔ یہ بیعت عَقَبَہ مقام پر پہلی مرتبہ ہوئی تھی، اس لیے اسے بیعت عَقَبَہ اُولیٰ کہتے ہیں۔ عَقَبَہ منیٰ کے قریب واقع ہے۔ اس بیعت کو بیعتُ النساء بھی کہتے ہیں کیونکہ یہ بیعت عورتوں کی شرائط پر تھی۔

ان لوگوں نے خواہش ظاہر کی کہ ہمارے ساتھ کوئی ایسا آدمی بھیجا جائے جو ہمیں اِسلام کی باتیں سکھائے، مدینے میں جا کر لوگوں کو ایک خدا کی طرف بلائے اور بتوں کی پوجا سے منع کرے۔ جب یہ لوگ واپس جانے لگے تو آنحضرت ﷺ نے اس کام کے لیے حضرت مُصْعَب بن عُمَیر رضی اللہ عنہ کو ان کے ساتھ کر دیا۔

حضرت مصعب رضی اللہ عنہ بڑے امیر گھرانے کے آدمی تھے۔ اِسلام لانے سے پہلے بڑی آن بان سے رہتے اور بہت قیمتی پوشاک پہنتے تھے۔ جب گھوڑے پر سوار ہو کر نکلتے تو آگے پیچھے نوکر چاکر ہوتے تھے۔ مگر جب مسلمان ہو گئے تو قیمتی پوشاکوں اور ظاہری ٹھاٹھ اور نمائش کو بالکل چھوڑ دیا۔ بڑی سادہ زندگی بسر کرنے لگے۔ جن دنوں آپ یثرِب میں اِسلام کی تبلیغ کرتے تھے ان دنوں ان کے کندھے پر صرف کمبل کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا ہوتا تھا جسے اٹکانے کے لیے اگلی طرف کیکر کے کانٹے لگا لیا کرتے تھے۔

مدینے میں پہنچ کر حضرت مصعب رضی اللہ عنہ نے لوگوں کے گھروں میں پھر پھر کر اِسلام کا پیغام پہنچانا شروع کیا۔ ان کی باتیں سن سن کر لوگ مسلمان ہونے لگے اور ایک سال کے اندر اندر بہت سے گھرانے مسلمان ہو گئے۔ اس طرح یثرِب میں اِسلام خوب پھیلنے لگا۔[1]

بیعتِ عَقَبَہ ثانیہ

اَگلے سال ۱۳ نبوّت کو حج کے موقع پر ۷۵ اشخاص یثرِب سے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں اسی جگہ حاضر ہو کر ایمان لے آئے۔ ان میں دو عورتیں بھی شامل تھیں۔ ان

[1] صحيح البخاري: ۱۸ ، ۳۸۹۲، ابن هشام ، السيرة النبوية: ۴۳۱/۱ ، ابن الأثير، الكامل: ۹۵/۲ ، ابن سعد، الطبقات الكبرى: ۲۱۹/۱

میں سے ہر ایک نے آپ ﷺ کی تابعداری کی قسمیں کھائیں اور ہر طرح کی امداد کا وعدہ کیا۔[1]

مدینے تشریف لے جانے کی درخواست

ان لوگوں نے حضرت رسولِ اکرم ﷺ سے عرض کیا کہ آپ ہمارے شہر میں تشریف لے چلیں اور غریب و کمزور مسلمانوں کو، جن پر مکہ میں ظلم ہوتا ہے، یثرب میں بھیج دیں۔ اس موقع پر حضرت رسولِ اکرم ﷺ کے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ بھی موجود تھے۔ اُنھوں نے مدینے والوں سے کہا کہ تمھیں بڑی مشکلات اور تکلیفوں کا سامنا کرنا پڑے گا جو کچھ کرو خوب سوچ سمجھ کر کرو۔ یثرب والوں نے پوری پوری امداد کا وعدہ کیا۔

یثرب کا ایک سردار عرض کرنے لگا: ''یا رسول اللہ! یہودیوں سے ہمارے تعلقات ہیں، اب یہ تعلقات ٹوٹ جائیں گے۔ ایسا نہ ہو کہ جب اِسلام طاقتور ہو جائے تو آپ ہمیں چھوڑ کر مکے واپس چلے جائیں۔'' حضرت رسولِ اکرم ﷺ نے مسکرا کر فرمایا: ''ایسا نہیں ہوگا۔ تمھارا خون میرا خون ہے۔ تم میرے ہو اور میں تمھارا ہوں۔''[2]

سرداروں کا انتخاب

اس کے بعد آپ ﷺ نے ان لوگوں میں سے بارہ سردار مقرر فرما دیے۔ ہر خاندان کا ایک ایک سردار تھا۔ حضرت رسولِ اکرم ﷺ نے ان سے فرمایا: ''ہر سردار اپنے اپنے خاندان کا نگران اور ذمہ دار ہے اور میں ساری قوم کا نگران ہوں۔ تم یثرب میں اِسلام پھیلاؤ، مکے میں یہ کام میں خود کروں گا۔''[3]

---

[1] ابن الجوزي، الوفا بأحوال المصطفى: ۱/۱۷۸، الفاسي، نفائس الدرر: ۱/۳۳۷

[2] ابن كثير، البداية والنهاية: ۳/۴۱۳-۴۲۸، ابن هشام، السيرة النبوية: ۱/۴۳۸-۴۶۷، البيهقي، دلائل النبوة: ۲/۴۴۲، مسند أحمد: ۱۴۴۵۶، ۱۴۶۵۳

[3] ابن حبيب، المحبر، ص: ۲۶۸، ابن كثير، البداية والنهاية: ۳/۴۱۸، ابن الجوزي، الوفا بأحوال المصطفى: ۱/۱۷۹

ہجرتِ مَدینہ

جب قریش مکہ مسلمانوں کو بہت زیادہ تکلیفیں دینے لگے اور یثرب میں اِسلام خوب پھیل گیا تو آنحضرت ﷺ نے مسلمانوں کو اجازت فرما دی کہ وہ وطن چھوڑ کر یثرب چلے جائیں۔ ہجرت کرنے والوں کو قریش مکہ کی بڑی سختیاں برداشت کرنا پڑیں اور بڑے ظلم سہنے پڑے۔ مشکلات اور مصیبتوں کے باوجود بہت سے مسلمان چھپ کر یثرب چلے گئے لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنی تلوار لے کر اور ہتھیار لگا کر کعبہ شریف میں آئے، طواف کیا اور دشمنوں کو للکارا مگر کسی کافر کو سامنے آنے کی ہمت نہ ہوئی۔ پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ مدینہ کی طرف روانہ ہو گئے۔[1]

اب مکّہ مکرمہ میں چند مسلمان رہ گئے تھے۔ مشہور صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے صرف حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ ہی آنحضرت ﷺ کے ساتھ مکے میں رہے۔[2]

قریش نے سوچا کہ یہ بڑا اچھا موقع ہے کہ آپ ﷺ کو قتل کر دیا جائے۔ اس مقصد کے لیے تدبیریں سوچی جانے لگیں۔ آخر یہ طے پایا کہ عرب کے ہر ایک مشہور قبیلے سے ایک جواں مرد چُن لیا جائے، یہ سب جوان رات کے اندھیرے میں آنحضرت ﷺ کے گھر کو گھیر لیں، جب آپ ﷺ صبح کی نماز کے لیے باہر نکلیں تو یہ سب اپنی اپنی تلوار سے وار کر کے آپ ﷺ کو قتل کر دیں۔[3]

اِدھر کفار مکہ نے آپ ﷺ کو قتل کرنے کا فیصلہ کیا، اُدھر حضرت رسولِ اکرم ﷺ کو اس منصوبے کی خبر ہوگئی۔ آپ ﷺ نے ہجرت کا ارادہ فرمایا۔ جب رات کو کفار نے حضرت رسولِ اکرم ﷺ کا گھر آ گھیرا تو آپ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا:

> ''تم میرے بستر پر میری سبز چادر لے کر لیٹ جاؤ، کوئی فکر کی بات نہیں، کوئی آدمی تمھارا بال بیکا نہ کر سکے گا''[4]

---

[1] السيوطي، تاريخ الخلفاء، ص: ۱۰۸، الهندي، كنز العمال: ۳۵۷۹۶، الطنطاوي، أخبار عمر، ص: ۲۵

[2] ابن الجوزي، الوفا بأحوال المصطفى: ۱/۱۸۱

[3] ابن كثير، البداية والنهاية: ۳/۴۳۷، ابن سعد، الطبقات الكبرى: ۱/۲۲۷

[4] ابن الجوزي، الوفا بأحوال المصطفى: ۱/۱۸۲، ابن هشام، السيرة النبوية: ۱/۴۸۲

حضرت علی رضی اللہ عنہ بے فکری سے مزے کی نیند سو رہے اور آنحضرت ﷺ خدا کی حفاظت میں باہر تشریف لے گئے اور کفارِ مکہ کی آنکھوں میں خاک ڈالتے سورۂ یٰس پڑھتے صاف نکل گئے۔ کسی شخص نے حضرت رسولِ اکرم ﷺ کو جاتے نہ دیکھا۔ یہ واقعہ ۲۷ صفر ۱۳ نبوت کا ہے۔[1]

غارِ ثور میں

حضرت رسولِ اکرم ﷺ سیدھے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے گھر پہنچے اور فرمایا کہ ''ہجرت کا حکم آ گیا ہے۔'' حضرت صدیق رضی اللہ عنہ نے ہمرکاب ہو کر شرفِ رفاقت کی اجازت چاہی۔ جلدی سے سفر کا سامان لیا۔ ایک تھیلے میں ستو ڈالے اور رات کے اندھیرے میں دونوں بزرگوار مکے سے نکل پڑے اور چار پانچ میل کے فاصلے پر پہاڑ کی ایک کھوہ تک، جس کو غارِ ثور کہتے ہیں، پہنچے۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضرت رسول اکرم ﷺ کو باہر ٹھہرایا۔ خود اندر جا کر غار کو صاف کیا اور پھر عرض کیا کہ آپ بھی تشریف لے آئیں۔

قریشِ مکہ پیچھے آئے۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کفار کو دیکھ کر گھبرائے تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ''گھبراؤ نہیں، اللہ ہمارے ساتھ ہے۔'' جب قریشِ مکہ آپ ﷺ کا کوئی کھوج نہ پا سکے تو ناکام واپس چلے گئے۔ پھر اُنھوں نے اعلان کر دیا کہ جو شخص آپ ﷺ کو پکڑ لائے اسے ایک سو اونٹ انعام دیے جائیں گے۔

حضرت رسولِ مقبول ﷺ اور حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ تین دن تک اس غار میں رہے۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے بیٹے حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ روزانہ چھپ کر آتے اور قریشِ مکہ کی باتیں اور حالات سنا جاتے۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کا غلام عامر رضی اللہ عنہ رات کے وقت بکریاں لا کر دودھ دے جاتا۔ بکریوں کے آنے جانے سے پاؤں کے نشان بھی مٹ جاتے۔[2]

---

[1] ابن الأثير، الكامل: ۱۰۳/۲، ابن سعد، الطبقات الكبرىٰ: ۳۲۸/۱، ابن هشام، السيرة النبوية: ۴۸۳/۱، الفاسي، نفائس الدرر: ۳۶۲/۲

[2] صحيح البخاري: ۹۰۵، صحيح مسلم: ۲۰۰۹، قبل رقم: ۳۰۱۵، ابن هشام، السيرة النبوية: ۴۸۶/۱، ابن سعد، الطبقات الكبرى: ۲۲۹/۱، ابن كثير، البداية والنهاية: ۴۴۱/۳

غار سے روانگی

چوتھے دن حضرت رسولِ اکرم ﷺ اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ غار سے نکل کر یثرب کو روانہ ہوئے۔ ایک شخص عبداللہ بن اُرَیقِط مدینے کا راستہ بتانے کے لیے ساتھ ہولیا۔[1]

یثرب کا راستہ بالکل ویران اور سنگلاخ تھا۔ راہ میں نہ کوئی سایہ دار درخت تھا نہ پانی۔ عام طور پر مشرقی راستہ استعمال ہوتا تھا جو بلادِ نجد کے سامنے سے گزرتا تھا، لیکن آپ ﷺ نے بُحَیرۂ احمر کے سامنے والا مغربی راستہ اختیار کیا۔ یہ راستہ اختیار کرنے کے باوجود آپ ﷺ کبھی اِدھر مڑ جاتے کبھی اُدھر، کبھی ساحل سمندر کے ساتھ ساتھ چلتے اور کبھی ساحل سے دُور ہٹ کر چلتے۔ پیچ کھاتے اور راستہ بدلتے ہوئے آپ ﷺ منزلیں طے کرتے چلے گئے تاکہ قریش کے کھوجی سراغ نہ پا سکیں۔ مختلف راہوں سے گزرتے ہوئے بالآخر آپ ﷺ وادیٔ عقیق میں داخل ہوئے اور وہاں سے ۱۲ ربیع الاول کو قُباء میں جا پہنچے۔ قباء میں حضرت عمرو بن عوف رضی اللہ عنہ کے ہاں قیام فرمایا۔ وہاں ایک مسجد کی بنیاد رکھی۔ قباء اور مدینہ منورہ کے درمیان تین میل کا فاصلہ ہے۔ قباء میں چار دن قیام رہا۔[2]

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے لوگوں کی وہ تمام امانتیں واپس کر دیں جو حضرت رسولِ اکرم ﷺ کے پاس رکھی ہوئی تھیں اور آنحضرت ﷺ کے قباء میں تشریف لانے سے تیسرے روز حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی آپ کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔[3]

---

[1] صحیح البخاري: ۳۹۰۵، ابن کثیر، البدایة والنهایة: ۳/۴۴۹ـ۴۵۸

[2] صحیح البخاري: ۳۹۰۶، صحیح مسلم: ۲۰۰۹، قبل رقم: ۳۰۱۵، ابن کثیر، البدایة والنهایة: ۳/۴۵۱، ابن هشام، السیرة النبویة: ۱/۴۹۱ـ ۴۹۴، ابن سعد، الطبقات الکبریٰ: ۱/۲۳۲

[3] ابن الأثیر، الکامل: ۲/۱۰۹، ابن هشام، السیرة النبویة: ۱/۴۹۳

تیسرا باب

مدینہ میں ورودِ مسعود

قباء میں چار دن قیام فرمانے کے بعد حضرت رسولِ اکرم ﷺ نے یثرب کا قصد فرمایا۔ یہ جمعہ کا دن تھا۔ راستے میں نماز جمعہ کا وقت آ گیا۔ بنو سالم کے محلے میں نماز جمعہ ادا کی۔ یہ پہلا جمعہ تھا۔ تاریخ اِسلام میں جمعہ کی ابتداء اسی دن سے ہوئی۔[1]

اس کے بعد آپ ﷺ اونٹنی پر سوار ہو کر یثرب کی طرف چل پڑے۔

شوقِ دید و استقبال

اہلِ یثرب کو آپ ﷺ کی روانگی کا علم ہو چکا تھا۔ وہ بڑی بے چینی سے آپ ﷺ کا انتظار کرنے لگے۔ مرد، عورت، بچے، بوڑھے سب حضرت رسولِ مقبول ﷺ کی زیارت کے لیے بے تاب تھے۔ آپ ﷺ کی تشریف آوری کا سن کر سارے شہر میں خوشی و مسرّت کی لہر دوڑ گئی۔ سرور و شادمانی کے شادیانے بجنے لگے۔ گلی کوچے نعروں سے گونج رہے تھے۔ شہر کے معزز لوگ آپ ﷺ کے استقبال کے لیے شہر سے باہر سڑک کے دونوں جانب کھڑے تھے۔ آپ ﷺ جس قبیلے کے سامنے سے گزرتے وہ عرض کرتا کہ اے اللہ کے رسول! یہ گھر، یہ مال و دولت اور یہ جان و دل حاضر ہے۔ آپ ﷺ سب کا شکریہ ادا کرتے اور دعا دیتے ہوئے گزر جاتے۔

حضرت رسولِ اکرم ﷺ کو دیکھنے کے لیے عورتیں چھتوں پر نکل آئیں اور معصوم بچیاں دَف بجاتی اور یہ اشعار گاتی تھیں (مطلب یہ ہے):

ان پہاڑوں سے جو ہیں سوئے جنوب	چودھویں کا چاند ہے ہم پر چڑھا
کیسا عمدہ دین اور تعلیم ہے	شکر واجب ہے ہمیں اللہ کا
حکم کی تیرے اِطاعت فرض ہے	بھیجنے والا ہے تیرا کبریا

[1] ابن هشام، السيرة النبوية: ١/٤٩٤ ، البيهقي ، دلائل النبوة: ٢/٥٠٠

حضرت رسولِ اکرم ﷺ اونٹنی پر سوار تھے۔ ہر آدمی کی یہ خواہش تھی کہ آپ ﷺ اس کے مہمان بنیں۔ اس مقصد کے لیے لوگ اونٹنی کو اپنے مکان کے سامنے روکنا چاہتے تھے۔ آنحضرت ﷺ ہر آدمی کو یہ جواب دیتے: ''چھوڑ دو، اسے حکم مل چکا ہے۔'' آخر چلتے چلتے اونٹنی اس مقام پر بیٹھ گئی جہاں اب مسجد نبوی ﷺ ہے۔ آنحضرت ﷺ اُتر پڑے اور حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کے مکان میں تشریف فرما ہوئے۔

یثرب میں تشریف فرما ہونے کی تاریخ ۱۲ ربیع الاول (۲۰ ستمبر ۶۲۲ء) ہے۔[۱] ہجرت کے بعد یثرب کو طیبہ یا مدینہ منورہ یا مدینۃ النبی ﷺ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔[۲] مسلمانوں کا سال بھی اسی ہجرت سے شروع ہوتا ہے۔ ہجرت سے پہلے کے واقعات کی تاریخ عام الفیل کے حساب سے شمار ہوتی تھی۔[۳]

مدینہ کے باشندے

آپ ﷺ کی ہجرت کے وقت مدینہ منوّرہ میں تین گروہ تھے:

۱۔ **مہاجرین:** یہ وہ لوگ تھے جو اِسلام قبول کر لینے کے بعد مکہ کو چھوڑ کر مدینہ منورہ میں آبسے تھے۔[۴]

۲۔ **اَنصار:** یہ مدینہ کے باشندے تھے جنھوں نے اِسلام قبول کر کے قریش کے مقابلہ پر پیغمبرِ اِسلام ﷺ اور مسلمانوں کی نصرت و امداد کی۔ اکثر انصار اَوس وخزرج کے قبائل میں سے تھے۔ انصار نے ہمیشہ جان و مال قربان کر کے اللہ اور رسول ﷺ کی

۱۔ صحيح البخاري :۳۹۰۶، البيهقي، دلائل النبوة :۲/ ۵۰۱ـ۵۰۷، ابن كثير، البداية والنهاية : ۳/ ۴۶۶، ابن هشام، السيرة النبوة : ۱/ ۴۹۴، ابن القيم، زاد المعاد : ۳/ ۵۵۱ـ بعض اہل علم کے نزدیک مذکورہ بالا اشعار کا ثبوت مضبوط نہیں۔

۲۔ ياقوت الحموي، معجم البلدان : ۴/ ۵۳، ۵/ ۸۲، الموسوعة العربية الميسرة : ۶/ ۲۰۸۰، البروسوي، أوضح المسالك، ص: ۴۶۰ـ۵۸۱

۳۔ الصفدى، الوافي : ۱/ ۳۲، تاريخ الطبري : ۴/ ۲۰۹، الطنطاوي، أخبار عمر، ص: ۲۰۳

۴۔ أبو شهبة، السيرة النبوية : ۲/ ۳۹

خوشنودی حاصل کی۔[1]

۳۔ **یہودی:** یہ لوگ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ماننے والے تھے۔ مدت سے جزیرۂ عرب میں آباد تھے۔ بنوقینقاع، بنونضیر اور بنوقُریظہ مشہور یہودی قبیلے تھے۔ یہودی اِسلام کے سخت دشمن تھے۔ قریش مکہ کے ساتھ ساز باز کر کے مسلمانوں کے خلاف نبرد آزما رہے۔ یہودی بڑے مالدار تھے۔ صنعت وحرفت، تجارت اور زراعت سب ان کے ہاتھ میں تھی۔ سودی لین دین بھی کرتے تھے۔ اِسلام دشمنی کی پاداش میں یہودیوں کو پہلے مدینہ سے پھر سارے جزیرۂ عرب سے نکال دیا گیا۔[2]

حضرت رسولِ اکرم ﷺ کے تشریف لانے کے بعد مدینے میں ایک نیا گروہ پیدا ہوگیا۔ یہ منافقین کی جماعت تھی۔ یہ لوگ زبان سے تو اِسلام کا اقرار کرتے لیکن دل سے اِسلام کے دشمن تھے۔

منافقین کا وجود سیاسی رقابت کا رہینِ منّت تھا۔ حضرت رسولِ اکرم ﷺ کے تشریف لانے سے پہلے مدینے میں سیاسی اقتدار حاصل کرنے کی کوشش جاری تھی۔ ایک شخص عبداللہ بن اُبَی (منافقین کا سردار) چاہتا تھا کہ مدینے میں اس کو سیاسی اقتدار حاصل ہو اور خزرج واَوس کے قبیلے اس کو اپنا بادشاہ تسلیم کرلیں۔ آپ ﷺ کے تشریف لانے کے بعد اس شخص کی اُمیدیں خاک میں مل گئیں۔ اس ناکامی وشکست نے بغض وحسد کی آگ بھڑکا دی اور درپردہ یہ شخص اِسلام دشمنی پر اُتر آیا۔ اس گروہ کا ذکر قرآن مجید میں کئی مقامات پر آتا ہے۔[3]

---

[1] التوبة :۹/ ۱۰۰، أبو شهبة، السيرة النبوية :۲/ ٤۱، الموسوعة العربية الميسرة :۱/ ٤۸۱

[2] المائدة :٥/ ٥۱، الشهرستاني ، الملل والنحل :۱/ ۲۱۸_۲۲٦ ، أبو شهبة ، السيرة النبوية: ۲/ ٤٥

[3] المائدة :٥/ ٤۱_٤٥ ، الأحزاب:۳۳/ ۱۲_۱٦ ، المنافقون :٦۳/ ۱_۸، أبو شهبة، السيرة النبوية : ۲/ ٤۲، ابن هشام ، السيرة النبوية :۱/ ٥۸٥

مسجد نبوی کی تعمیر

مدینہ منورہ میں پہنچ کر حضرت رسولِ اکرم ﷺ نے سب سے پہلے ایک مسجد کی بنیاد رکھی جو مسجد نبوی کے نام سے مشہور ہوئی۔ شروع میں یہ مسجد کھجور کی ڈالیوں اور کچی اینٹوں کی عمارت تھی۔ آپ ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ مل کر اس مسجد کو تعمیر کیا تھا۔

نمازِ باجماعت کے علاوہ سیاسی اور اجتماعی لحاظ سے اِسلام میں مسجد کو بڑی اہمیت تھی۔ تمام مشورے، اجلاس واجتماع اور وفود کا قیام مسجد میں ہوتا تھا۔ مسجد کے بعد آپ ﷺ نے اپنا حجرہ بنوایا۔ پھر دوسرے حجرے تعمیر ہوئے۔ حضرت ابواَیّوب انصاری رضی اللہ عنہ کے گھر میں سات مہینے قیام فرمانے کے بعد آپ ﷺ اپنے گھر تشریف لے گئے۔[1]

مسجد کے ایک حصہ میں ایک چھت والا چبوترا بنایا گیا، جسے صُفّہ کہتے تھے۔ یہاں نادار اور بے گھر لوگ رہتے تھے۔ یہ لوگ علم دین سیکھتے تھے اور تبلیغ واشاعت کی تربیت حاصل کرتے تھے۔ وہ صبر وتوکل کے پیکر تھے۔ ان لوگوں کو ''اَصحابِ صُفّہ'' کہتے تھے۔[2]

جمعہ کی ابتداء

جب تک پیغمبر اِسلام علیہ الصلاۃ والسلام مکے میں مقیم رہے ارکانِ اِسلام کی ادائیگی میں پوری آزادی حاصل نہ کرسکے۔ جونہی مکے سے ہجرت کرکے مدینے کے قرب وجوار میں پہنچ کر آزادی کی فضا میں سانس لیا، اِسلامی نظامِ حیات اور اِسلامی معاشرہ کی تشکیل شروع کردی۔ نمازِ جمعہ اِسلامی معاشرہ کی تشکیل کی پہلی کڑی تھی۔

ہجرت کے وقت جب مدینے تشریف لائے تو پہلے قُباء میں حضرت عمرو بن عوف رضی اللہ عنہ کے ہاں چار روز تک قیام فرمایا اور وہاں کے مسلمانوں کے لیے ایک مسجد کی بنیاد رکھی۔ جمعہ کے دن قباء سے روانہ ہوئے تو نماز کا وقت بنوسالم کی بستی میں آگیا۔ چنانچہ نماز جمعہ بنوسالم میں ادا کی۔ یہ پہلا جمعہ تھا۔[3]

---

[1] صحيح البخاري: ٣٩٣٢ـ ٤٢٨، صحيح مسلم: ٥٢٤، ابن كثير، البداية والنهاية: ٤٨٩/٣

[2] ابن سعد، الطبقات الكبرى: ٢٥٥/١

[3] ابن هشام، السيرة النبوية: ٤٩٤/١، البيهقي، دلائل النبوة: ٥٠٠/٢

پہلا خطبۂ جمعہ

اس جمعہ کے خطبہ میں حمد وثناء کے بعد آپ ﷺ نے فرمایا:

''لوگو! اپنے لیے زادِ راہ تیار کرو۔ بخدا! تم میں سے کوئی اچانک مرجائے گا اور اپنا گلّہ بغیر گلّہ بان کے چھوڑ جائے گا۔ پھر اس کا رب جس کا کوئی ترجمان اور دربان نہیں، اس سے فرمائے گا: کیا میرے رسول نے آکر تجھے میرا پیغام نہیں پہنچا دیا تھا؟ کیا میں نے تجھے مال و دولت اور نعمتوں سے سرفراز نہیں کیا تھا؟ اب بتا تو اپنے لیے کیا توشہ لایا ہے؟ اس وقت وہ آدمی دائیں بائیں دیکھے گا لیکن اسے کچھ نظر نہ آئے گا۔ پھر وہ اپنے سامنے دیکھے گا اور سوائے جہنم کے اور کچھ دکھائی نہ دے گا۔ پس جو شخص آدھی کھجور دے کر بھی دوزخ سے بچ سکتا ہے اسے ضرور بچنا چاہیے۔ جسے یہ بھی میسر نہ آسکے تو اچھی بات بتا کر دوزخ سے بچ جائے کیونکہ ایک نیکی کے بدلے دس سے سات سو نیکیوں تک اجر ملتا ہے۔ والسلام۔''[1]

یہ خطبہ بڑا مختصر لیکن بڑا جامع ہے۔ نیک سیرت، نیک کردار اور نیک چلنی پر آپ ﷺ نے بڑا زور دیا ہے۔ اگر اس خطبہ کی رُوح کو سمجھ لیا جائے تو انسانی معاشرہ تمام برائیوں سے پاک ہو کر جنت کی زندگی کا نمونہ بن سکتا ہے۔

اَذان کی ابتداء

مسجدِ نبوی کی تعمیر کے بعد مسلمان نماز کے لیے بغیر کسی اذان یا گھنٹی کے جمع ہو جاتے تھے۔ ہر ایک کی یہ خواہش تھی کہ نماز کے لیے مسلمانوں کو بلانے کے لیے کوئی تدبیر سوچنی چاہیے۔ ایک دن اس موضوع پر گفتگو ہونے لگی، کچھ لوگوں نے کہا کہ عیسائیوں کی طرح

[1] البیهقي، دلائل النبوة: ۲/۵۲٤، الهندي، کنز العمال: ۱٦۱۰۱

ناقوس بجایا جائے۔ بعض نے یہ مشورہ دیا کہ یہودیوں کی طرح بُوق یعنی بگل بجا دیا جائے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مشورہ دیا کہ کوئی آدمی نماز کے لیے پکارا کرے۔[1]

اس کے بعد حضرت بلال رضی اللہ عنہ نماز کے وقت " اَلصَّلٰوۃُ جَامِعَۃٌ "پکارا کرتے تھے۔[2]

ان کے علاوہ حضرت عبداللہ بن زید انصاری رضی اللہ عنہ بھی اسی طرح بلند آواز سے لوگوں کو نماز کے لیے جمع کرتے تھے۔[3]

ایک دن حضرت عبداللہ بن زید انصاری رضی اللہ عنہ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوکر عرض کرنے لگے کہ میں نے خواب میں دیکھا کہ ایک شخص سبز کپڑے پہنے قبلہ رُو ہوکر اللہ اکبر اللہ اکبر پکار رہا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''یہ خواب سچا ہے۔'' پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آکر اسی طرح کا خواب سنایا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ مجھے اس سے پہلے بذریعہ وحی اسی اذان کا حکم مل چکا ہے۔

چنانچہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو، جو بلند آواز تھے، اذان کے کلمات سکھا کر اذان پکارنے کے لیے منتخب کرلیا گیا۔[4]

مہاجرین وانصار

جن لوگوں نے حضرت رسولِ اکرم ﷺ کے حکم سے اللہ تعالیٰ کی راہ میں اپنا گھر بار چھوڑا اور مدینے آئے، وہ مہاجرین کہلاتے ہیں اور جن لوگوں نے مدینے شریف میں حضرت رسولِ اکرم ﷺ اور مہاجرین کی مدد کی، وہ انصار کہلاتے ہیں۔[5]

---

[1] صحيح البخاري: ٦٠٤ ، صحيح مسلم: ٣٧٧

[2] ابن سعد، الطبقات الكبرى: ٢٤٦/١، ٢٤٧ ، ابن حجر ، فتح الباري: ٨٢/٢، أنور الكشميري ، فيض الباري: ١٥٧/٢

[3] ابن حجر، فتح الباري: ٤٠٧/٣

[4] سنن أبي داود: ٤٩٨ ـ ٤٩٩ ، سنن ابن ماجه: ٧٠٦

[5] أبو شهبة ، السيرة النبوية: ٣٩/٢ـ٤٢

مُؤاخات

مہاجرین اپنا گھر بار اور مال و دولت چھوڑ کر مدینے شریف میں آ بسے۔ ان کے پاس نہ تو رہنے کے لیے مکان تھے اور نہ روزی کا کوئی بندوبست، وہ بالکل پریشان اور تباہ حال تھے۔ اس بے سرو سامانی میں حضرت رسولِ اکرم ﷺ نے ایک ایک مہاجر کو ایک ایک انصاری کا بھائی بنا دیا۔ اس بھائی چارے کا نام مؤاخات ہے۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے لیے حضرت خارجہ بن زید رضی اللہ عنہ کو بھائی بنایا۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے لیے حضرت عتبان بن مالک رضی اللہ عنہ کو،

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے لیے حضرت اوس بن ثابت رضی اللہ عنہ کو،

حضرت ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ کے لیے حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کو،

حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کے لیے حضرت سعد بن ربیع رضی اللہ عنہ کو۔

اسی طرح ہر ایک انصاری کے لیے ایک مہاجر بھائی مقرر کر دیا۔[1]

اَنصار کا ایثار

مؤاخات کے بعد انصار نے بڑے ایثار اور فراخ دلی سے کام لیا اور مہاجرین کے ساتھ ایسی دوستی اور ہمدردی کا ثبوت دیا جس کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی۔ ہر ایک انصاری نے اپنے مہاجر بھائی کو اپنے گھر میں جگہ دی۔ اپنے کھیت بانٹ دیے اور خوشی خوشی اپنے کاروبار اور تجارت میں شریک کر لیا۔[2] مہاجرین اور انصار کا یہ بھائی چارہ اتنا مضبوط ہو گیا کہ وفات کے بعد وہ ایک دوسرے کے مال و دولت کے وارث بنتے تھے۔ انصار کے حسنِ سلوک اور

---

[1] صحيح البخاري: ٢٢٩٤، صحيح مسلم: ٢٥٢٩، مسند أحمد: ١٢٠٨٩، ابن كثير، البداية والنهاية: ٣/٥٠٦ ـ ٥١١، ابن حبيب، المحبر، ص: ٧١۔ روایات میں بہت سارے انصار و مہاجرین صحابہ کی مؤاخات کا ذکر ملتا ہے۔

[2] مسند أحمد: ١٣٨٦٣، ابن كثير، البداية والنهاية: ٣/٥٠٨

فیاضی کی وجہ سے مہاجرین یہ محسوس کرتے تھے کہ وہ مدتوں سے مدینے میں رہتے چلے آ رہے ہیں۔[1]

مہاجرین کی خودداری

مہاجرین تجارت کرتے تھے۔ وہ بڑی محنت اور کوشش سے کام کرتے اور آہستہ آہستہ اس لائق ہو گئے کہ اپنا الگ کاروبار کرنے لگے۔ جب حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کو ان کے انصاری بھائی نے ہر ایک چیز کا نصف حصہ دینا چاہا تو اُنھوں نے کہا کہ مجھے ان چیزوں کی ضرورت نہیں۔ مجھے صرف بازار کا رستہ بتا دو۔ بازار دیکھنے کے بعد اُنھوں نے اپنا کاروبار شروع کر دیا اور تھوڑے ہی عرصے میں بہت دولت پیدا کر لی اور کاروبار کو دوسرے ملکوں تک پھیلا دیا۔[2]

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے کپڑے کی تجارت شروع کی اور کاروبار میں خوب ترقی کی۔[3]

اسی طرح حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کھجوروں کی تجارت کرنے لگے۔[4]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا تجارتی مال ایران تک جاتا تھا۔[5]

مہاجرین نے بڑی محنت اور دیانت سے کاروبار کیا اور تھوڑی ہی مدت میں اپنے پاؤں پر کھڑے ہو گئے۔

---

[1] ابن حبیب ، المحبر،ص: ۷۱ ، سعید حوّی ، السیرۃ النبویۃ :۱/۴۰۰، السھیلي ، الروض الأنف: ۲/۲۵۲

[2] صحیح البخاري :۲۰۴۸۔۲۰۴۹، ۳۷۸۰ ، مسند أحمد :۱۳۸۶۳

[3] ابن سعد،الطبقات الکبریٰ :۳/۱۷۲۔۱۸۶

[4] ابن سعد،الطبقات الکبریٰ :۳/۶۰

[5] ابن سعد،الطبقات الکبریٰ :۳/۲۷۸

معاہدۂ مدینہ

حضرت رسولِ اکرم ﷺ مدینے تشریف لائے تو یہاں کے دو قبیلے اَوس اور خزرج آپس کی لڑائیوں سے تنگ آ چکے تھے۔[1]

مدینے کے یہودی بڑے دولت مند تھے۔ ان کی تجارت دُور دُور ملکوں تک پھیلی ہوئی تھی۔ مدینے کے آس پاس ان کی آبادیاں تھیں جن میں چھوٹے چھوٹے قلعے بھی تھے۔[2]

حضرت رسولِ اکرم ﷺ نے ہجرت کے پہلے سال ارادہ فرمایا کہ مدینہ منورہ میں امن قائم رکھنے کے لیے یہودیوں سے معاہدہ کر لیا جائے تاکہ ایک طرف مسلمانوں اور یہودیوں کے تعلقات مضبوط ہو جائیں اور شہر میں امن اور اطمینان کی حالت پیدا ہو جائے اور دوسری طرف کسی بیرونی حملے کی روک تھام ہو سکے۔ اس معاہدے کے دو حصے تھے:

(الف) پہلا حصہ انصار اور مہاجرین کے متعلق تھا۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ

۱۔ تمام مسلمان خواہ انصار ہوں یا مہاجرین ایک ہی اُمت ہیں۔

۲۔ یہ اُمت دوسری قوموں اور جماعتوں سے بالکل الگ ہے۔

۳۔ سب مسلمان آپس میں ایک دوسرے کی مدد کریں گے اور دُشمنوں کے مقابلے پر متحد ہو کر لڑیں گے۔

۴۔ کوئی مسلمان کسی دوسرے مسلمان کو کافر کے بدلے میں قتل نہیں کرے گا۔

۵۔ نہ کوئی مسلمان کسی دوسرے مسلمان کے خلاف کسی کافر کو مدد دے گا۔

۶۔ شرارت پسند اور فتنہ انگیز عناصر کا قلع قمع کرنے کے لیے محلّہ دار امن کمیٹیاں قائم کر کے

---

[1] الموسوعة العربية الميسرة :۱٤۳۷/۳

[2] الموسوعة العربية الميسرة :۳٦٥٥/۷، أبو شهبة، السيرة النبوية :٤٥/۲

فیصلہ کیا کہ اس ضمن میں کسی قرابت داری کا خیال نہ رکھا جائے گا۔

(ب) اس معاہدے کا دوسرا حصہ یہودیوں کے متعلق تھا۔ اس میں اقرار کیا گیا تھا کہ

۱۔ یہودیوں اور مسلمانوں کے درمیان صلح رہے گی۔

۲۔ دونوں ایک دوسرے کی خیرخواہی کریں گے۔

۳۔ اگر دونوں فریقوں میں سے کسی ایک پر کوئی بیرونی قوت حملہ کرے تو دونوں مل کر اس کا مقابلہ کریں گے۔

۴۔ اگر دشمن سے جنگ شروع ہو جائے تو یہودی بھی مسلمانوں کے ساتھ لڑائی کے اخراجات برداشت کریں گے۔

۵۔ یہودیوں کی دوست قوموں کے بھی وہی حقوق ہوں گے جو یہودیوں کے ہیں۔

۶۔ مدینہ منورہ کے اندر کشت وخون سب قوموں پر حرام ہوگا۔

۷۔ اگر دونوں قوموں میں کوئی جھگڑا پیدا ہو جائے تو حضرت رسولِ اکرم ﷺ کا فیصلہ دونوں کو تسلیم کرنا پڑے گا۔[۱]

اس معاہدہ کی رُو سے مسلمانوں کو ایک اَلگ قوم قرار دیا گیا۔ نسل وخون کے رشتے کی فوقیت ختم کر دی گئی اور اس کی جگہ دین اور عقیدے کے رشتے کو اتحاد واتفاق کا سرچشمہ ٹھہرایا۔ دینی تعلق کو نسلی اور خاندانی تعلق پر ترجیح دی گئی۔

مسلمانوں کے جماعتی اور اجتماعی مفاد کو انفرادی مفاد پر ترجیح دی گئی۔

رفاہِ عام کے کاموں نیز سیاسی اور اجتماعی معاملات میں یہودیوں اور مسلمانوں کو برابر کے حقوق وفرائض کا ذمہ دار ٹھہرا کر اسلام کی طرف آنے والوں کے لیے میدان ہموار کر دیا۔ نیز اعلان فرما دیا کہ مُسلم اور غیر مسلم حقوقِ شہریت میں برابر ہیں۔

[۱] ابن كثير، البداية والنهاية: ٣/٥٠٥، ابن هشام، السيرة النبوية: ١/٥٠١-٥٠٤

اس معاہدے کی رُو سے حضرت رسولِ اکرم ﷺ کو مدینے میں مسلمانوں کا قائد و رہنما تسلیم کر لیا گیا اور آپ ﷺ کے حاکمانہ سیاسی اقتدار اور عدل و انصاف کا بھی اعتراف کرتے ہوئے آپ ﷺ کو تمام جھگڑوں اور تنازعات میں مُنصف مان لیا گیا اور آپ ﷺ کا فیصلہ قطعی اور حتمی قرار دیا گیا۔

اس معاہدے پر مدینے کے تمام قبیلوں اور قوموں نے دستخط کیے تھے۔ اس کے بعد حضرت رسولِ اکرم ﷺ نے ارادہ فرمایا کہ مدینے کے آس پاس کے قبیلوں کو بھی اس معاہدے میں شامل کر لیا جائے۔ اس کے دو فائدے ہوں گے:

۱۔ قبائل کی خانہ جنگی ختم ہو جائے گی۔

۲۔ قریش مکہ ان قبیلوں کو مسلمانوں کے خلاف اُکسا نہ سکیں گے۔

اس نیک مقصد کی خاطر حضرت رسولِ اکرم ﷺ نے قبائل میں سفر کر کے کئی قبیلوں کو اس معاہدے میں شامل کر لیا۔ یہ واقعہ ہجرت کے پہلے سال کا ہے۔ اس طرح اِسلام کا سیاسی اور دینی نظامِ حکومت پہلے ہی سال معرضِ وجود میں آ گیا۔

روزوں کی فرضیّت

جب دلوں میں توحید پوری طرح راسخ و جاگزیں ہو چکی، نماز کی عادت پڑ گئی، قرآنِ مجید اور احکامِ الٰہی سے اُنس و محبت پیدا ہو گئی، مدینے پہنچ کر مسلمانوں نے آزاد سیاسی فضا میں سُکھ کا سانس لیا، اِسلام کے سیاسی و دینی نظامِ حکومت کی بنیاد رکھی جا چکی اور مسلمان اللہ کی راہ میں بھوک اور پیاس کی تکلیف کو برداشت کرنے کے لیے آمادہ نظر آنے لگے تو ۲ ہجری میں رمضان کے روزے فرض ہوئے۔[1]

روزے آہستہ آہستہ فرض ہوئے اور ان کی تعداد بھی تدریجی طور پر مقرر ہوئی۔ ابتداء میں مہینے کی تخصیص نہ تھی۔ جب ۲ ہجری میں شعبان کا مہینہ آیا تو حضرت رسولِ مقبول ﷺ

[1] ابن كثير، البداية والنهاية: ٣٤/٤

نے اعلان فرمایا کہ ''اب کی مرتبہ ماہِ رمضان روزوں کا مہینہ ہوگا۔'' چنانچہ سب مسلمانوں نے رمضان میں روزے رکھے۔[1]

جب رمضان ختم ہونے میں دو دن باقی رہ گئے تو آپ ﷺ نے مسلمانوں کے اجتماع میں صدقۂ فطر اور نمازِ عید الفطر ادا کرنے کا حکم سنایا۔[2]

ہجرتِ مدینہ کی اہمیت

تاریخِ اسلام میں اس ہجرت کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ جب پیغمبر خدا ﷺ ہجرت فرما کر مدینہ میں تشریف لے آئے تو تاریخِ اسلام میں ایک نہایت ہی شاندار باب کا آغاز ہوا۔

مکی زندگی میں کفارِ مکہ کی دشمنی اور مشرکین قریش کی مخالفت کی وجہ سے اِسلام کی تبلیغ و اشاعت کھلے بندوں ممکن نہ تھی۔ جو لوگ اِسلام میں داخل ہوتے مشرکین اُنھیں سخت تکلیفیں پہنچاتے اور ان کے لیے جینا محال کر دیتے تھے۔

مدینہ میں اِسلام کو آزاد فضا میسر آئی اور دین اسلام کی تبلیغ کھلم کھلا ہونے لگی۔ انفرادی و اجتماعی آزادی کی وجہ سے اِسلام بڑی تیزی سے پھیلنے لگا۔ ہجرت سے کچھ پہلے مدینہ میں تبلیغ کے لیے زمین ہموار ہو چکی تھی۔ بیعتِ عَقَبہ اُولیٰ اور بیعتِ عَقَبہ ثانیہ کی بدولت مدینہ میں مسلمانوں کی ایک جماعت پیدا ہو چکی تھی۔ یہی جاں نثار مسلمان بعد میں انصار کے معزز لقب سے سرفراز ہوئے۔ حضرت مُصْعَب بن عمیر رضی اللہ عنہ کی تبلیغ سے یہ مخلص جماعت روز بروز بڑھتی چلی گئی۔[3] ملک حبش میں اگر چہ کچھ مسلمانوں کو سکون مل گیا لیکن وہاں تبلیغ

---

[1] صحیح البخاري :١٨٩٢ـ١٨٩٣ ، ٤٥٠١ـ٤٥٠٤ ، مسند أحمد :٢٢١٢٤، تاریخ الطبري :٤١٧/٢ ، تفسیر ابن کثیر :٣٦٤/١ ، تفسیر القرطبي:١٢١/٣ـ ١٤٨ ، ابن کثیر، البدایة و النهایة :٣٥/٤

[2] صحیح البخاري :١٥٠٣ـ١٥١٢، صحیح مسلم :٩٨٤ـ٩٨٥

[3] ابن هشام ، السیرة النبویة :٤٣٤/١

واشاعت کے مواقع پیدا نہ ہو سکے۔ زبان کی دقت کے علاوہ وہاں کا ماحول چنداں ساز گار نہ تھا۔ پھر وہ جگہ عرب اور بالخصوص بیت اللہ شریف سے بہت دُور تھی اور یہی بیت اللہ مسلمانوں کا دینی مرکز بننے والا تھا۔

مدینہ دفاعی حیثیت سے بھی مضبوط اور محفوظ شہر تھا۔ پہاڑوں اور نخلستانوں کی وجہ سے دشمنوں کی زد سے قدرے بچا ہوا تھا۔

علاوہ ازیں مدینہ ایسی شاہراہ پر واقع تھا جہاں سے اکثر آنے جانے والے قافلوں کو گزرنا پڑتا تھا۔ مدینے میں رہ کر مسلمان سیاسی اور معاشی دباؤ ڈال سکتے تھے۔

آنحضرت ﷺ نے ۱۳ نبوّت، ۶۲۲ عیسوی میں مدینہ کو ہجرت فرمائی اور اسی نسبت سے اسلامی تقویم یعنی سن ہجری کا آغاز ہوا۔[1]

مدینہ میں پہنچ کر اِسلامی مؤاخات کی بدولت مسلمان ایک مضبوط ملت اور متحدہ قوم بن گئے۔ سیاسی اور معاشی اعتبار سے مسلمان نہ صرف آزاد تھے بلکہ روز بروز مضبوط تر ہوتے چلے گئے۔ مسلمانوں کو دینی اُخوت اور اِسلامی برادری میں اس طرح منظم کر دیا گیا کہ غلام و آقا، حاکم و محکوم اور ادنیٰ و اعلیٰ کے امتیازات یکسر مٹا دیے۔ نسل اور قومیت کی بجائے تقویٰ کو معیار فضیلت قرار دیا۔ یہودیوں سے معاہدہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ مسلمان صلح و امن کی زندگی چاہتے تھے اور دوسری قوموں کے لیے خطرہ نہ بننا چاہتے تھے۔ ہجرت کے بعد اِسلام سارے جزیرۃ العرب میں پھیل گیا۔ اِسلام کا پیغام دنیا کے بڑے بڑے ملکوں میں ان کے سربراہوں کے ذریعے پہنچایا گیا۔

ہجرت کے بعد اِسلام کے بدترین دشمنوں کو سرنگوں کیا گیا۔ مخالف قوتوں کا زور توڑ دیا گیا اور بدر، احد، خندق کی جنگوں میں مسلمانوں کے سیاسی تدبر اور فوجی قوت کا لوہا منوایا گیا۔ فتح مکہ سے مسلمانوں کو بیت اللہ کی تولیّت کا شرف بھی حاصل ہو گیا۔

ہجرتِ مدینہ کی بدولت اِسلامی فتوحات کا دروازہ کُھل گیا اور بعد میں عرب کے مسلمان

---

[1] ابن جریر الطبری، تاریخ: ۳۸۸/۲

قیصر و کسریٰ کی عظیم الشان سلطنتوں کے وارث بنے۔ افریقہ کے صحراؤں میں پہنچے، اندلس کو فتح کیا، چین اور یورپ کی سرحدوں تک بڑھتے چلے گئے۔

یہ ہجرت کا انعام تھا کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی ایک مجبور و مقہور اقلیت کو ایک غالب اور فاتح اکثریت بنا دیا اور ایسی عظیم الشان حکومت عطا کی کہ آج تک اس کے آثار اسلامی حکومتوں کی شکل میں موجود ہیں۔

ہجرت سے یہ سبق ملتا ہے کہ مسلمان جب بھی دین اور مذہب کے لیے قربانی اور ایثار کرتا ہے تو اس کا شاندار صلہ پاتا ہے۔ آنحضرت ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے وطن عزیز کو محض اللہ تعالیٰ کے دین کی خاطر چھوڑا تو اس کا اتنا بڑا انعام ملا کہ آج تک آپ ﷺ کی اُمت اس انعام سے بہرہ مند چلی آ رہی ہے۔

چوتھا باب

غزوات النبی ﷺ

قریش مکہ کو حضرت رسولِ اکرم ﷺ اور مسلمانوں کے ساتھ ایسی دشمنی تھی کہ گھر بار اور مال و متاع چھوڑ کر مدینے آ جانے کے بعد بھی چین نہ لینے دیا۔ اُنھوں نے مدینے کے بت پرست قبیلوں اور یہودیوں سے ساز باز کر کے مسلمانوں کو تنگ کرنا اور ستانا شروع کر دیا۔

جب رسولِ اکرم ﷺ نے دیکھا کہ قریشِ مکہ اپنی شرارتوں سے باز نہیں آتے اور مسلمانوں کو مدینے میں بھی چین سے بیٹھنے نہیں دیتے تو آپ ﷺ نے اللہ تعالیٰ سے حکم پا کر اپنے ساتھیوں کو اجازت دے دی کہ وہ اپنی حفاظت اور دین کے بچاؤ کے لیے اللہ کی راہ میں لڑیں۔[1] جس لڑائی میں حضرت رسولِ اکرم ﷺ خود شامل ہوئے اس کو غزوہ کہتے ہیں۔ ایسی بہت سی لڑائیاں غزوات کہلاتی ہیں۔[2]

جہاد فی سبیل اللہ

ذاتی حفاظت اور دین کو بچانے کے لیے خدا کی راہ میں لڑنے کو جہاد فی سبیل اللہ کہتے ہیں۔ جہاد کے تین درجے ہیں:

(۱) **جہادِ نفس:** اپنے آپ کو حق و صداقت اور رشد و ہدایت کی تلاش و جستجو پر مجبور کرنا جہادِ نفس ہے۔ اس کے بغیر دین و دنیا کی سعادت حاصل نہیں ہو سکتی۔ پھر علم کے بعد عمل کے لیے نفس کو مجبور کرنا، علم و عمل کے بعد تعلیم و تبلیغ کے ذریعے دینِ حق کو پھیلانا

---

[1] الحج: ۳۹/۲۲۔۴۰

[2] صحيح البخاري: ٤٤٧١، ابن حجر، فتح الباری: ٢٧٩/٧، الموسوعة العربية الميسرة: ٢٣٣٢/٥

اور اس کی راہ میں مصائب و تکالیف کو خندہ پیشانی اور صبر و استقلال سے برداشت کرنا بھی جہادِ نفس ہے۔

(۲) **جہادِ شیطان:** شیطان ایمان میں شکوک و شبہات پیدا کر کے انسان کو گمراہ کرنا چاہتا ہے۔ اس سلسلے میں شیطانی وسوسوں کا مقابلہ کرنا جہادِ شیطان کہلاتا ہے۔ اس کے بعد شیطان کے پیدا کردہ برے خیالات اور بد ارادوں کو روکنے اور ان سے بچنے کی کوشش کرنا یقین اور صبر پیدا کرتا ہے۔

(۳) **جہادِ کفار و منافقین:** دل و زبان سے، مال و جان سے خدا کی راہ میں کافروں اور منافقوں سے برسرِ پیکار ہونا۔[1]

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''جو کوئی جہاد کے بغیر یا کم از کم اس کی تمنا کیے بغیر مر جائے اس کی موت مسلمانوں کی موت نہیں ہے، بلکہ ایک لحاظ سے منافق کی موت ہے۔''[2]

جہادِ نفس اور جہادِ شیطان فرض عین ہے۔ جہادِ کفار و منافقین کبھی فرض عین ہوتا ہے اور کبھی فرض کفایہ۔ اگر ضرورت کے مطابق لوگ میدانِ جنگ میں مصروف ہوں تو باقی اُمت پر فرض نہیں ہوتا مگر بصورت دیگر سب پر فرضِ عین ہو جاتا ہے۔ باقاعدہ نظامِ حکومت کی صورت میں یہ ذمہ داری حکومت پر عائد ہوتی ہے۔ اگر عوام سستی کریں تو حکومتِ وقت جبری بھرتی کر سکتی ہے۔ حکومت کی موجودگی میں اَفراد کو انفرادی طور پر اجازت نہیں۔

جہاد سے دین کی حفاظت و مدافعت اور خدا کا بول بالا کرنا مقصود ہوتا ہے۔

غلط فہمی کا ازالہ

بعض ناواقف اور بے سمجھ لوگوں نے جہاد سے یہ مطلب نکالا کہ اِسلام بزورِ شمشیر پھیلایا

---

[1] ابن القيم ، زاد المعاد :٣/٩-١١

[2] صحيح مسلم :١٩١٠، مسند أحمد :٨٨٦٥

گیا، حالانکہ یہ قطعاً غلط ہے۔ قرآن مجید میں اس بات کی صراحت و وضاحت کردی گئی ہے کہ دین کے معاملے میں جبر ہرگز جائز نہیں۔[1]

نبی کریم ﷺ نے اسلام کی تبلیغ کا آغاز جن حالات میں کیا وہ سب کے سامنے ہیں۔ مکہ مکرمہ میں جب اعلان توحید کیا گیا تو کس کے ہاتھ میں تلوار تھی؟ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا ایمان لائیں، حضرت علی رضی اللہ عنہ ایمان لائے، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ، عثمان رضی اللہ عنہ، زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ، سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ، عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ اور کئی جلیل القدر صحابہ رضی اللہ عنہم ایمان لائے۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ جیسے جری اور نڈر بھی مسلمان ہوئے۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ اور عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ جیسے بہادر اور جنگجو سپہ سالار بھی اسلام لائے۔ آخر کس کی تلوار نے ان شیر دل بہادروں کو گھائل کیا۔ یہ لوہے کی تلوار نہ تھی بلکہ دلائل و براہین کی سیف برّاں تھی جو اپنے جوہر دکھا گئی۔ یہ اسلام کی صداقت اور آنحضرت ﷺ کی حقانیت تھی جس نے ان بہادروں کے دلوں کو موہ لیا۔

درحقیقت اسلام کی سچائی، عدل و انصاف، مساوات اور اخوت ہی تو تھی جو دلوں کو مسخر کر رہی تھی۔

مقصدِ جہاد

جہاد کی ایک غرض و غایت ذاتی دفاع تھی۔ مظلوم کو قرآنِ مجید نے اجازت دے دی کہ وہ ہتھیار اٹھائے اور ناحق بے وطن کیے جانے کا انتقام لے۔[2]

نیز اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ ”کمزور و ناتواں مردوں، عورتوں اور بچوں کی فریاد سن کر ان کی امداد و اعانت کو نکلو۔“[3] جہاد کا دوسرا مقصد یہ تھا کہ تبلیغ و اشاعت کی راہ سے روک ٹوک ختم کر دی جائے تاکہ اسلام میں داخل ہونے والوں کو کسی قسم کی مزاحمت پیش نہ آنے

---

[1] البقرة: ٢/٢٥٦

[2] الحج: ٢٢/٣٩۔٤٠

[3] النساء: ٤/٧٥

پائے۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ اور حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ سے اِسلام لانے کی پاداش میں کیا کچھ نہیں کیا گیا۔[1]

جب قریشِ مکہ نے دوسرے عرب قبائل سے گٹھ جوڑ کر کے مسلمانوں پر حملہ کرنے کی ٹھانی تو تمام مشرکوں سے لڑائی کو جائز قرار دے دیا گیا۔[2] جب یہود مدینہ نے بدعہدی کر کے مسلمانوں کے خلاف مشرکین مکہ سے تعاون کیا تو اللہ تعالیٰ نے بذریعہ قرآنِ مجید اجازت دے دی کہ بدعہدی اور خیانت کرنے والوں کو سزا دینے کے لیے ان کے خلاف اعلانِ جنگ کر دو اور انھیں چن چن کر قتل کر دو۔[3]

آنحضرت ﷺ نے بنفسِ نفیس ستائیس چھوٹی بڑی جنگوں اور مہموں میں شرکت فرمائی اور اڑتیس لڑائیوں اور مہموں پر لشکر روانہ فرمائے۔ ان جنگوں میں غزوۂ بدر، غزوۂ اُحد، غزوۂ خندق، غزوۂ خیبر، غزوۂ مؤتہ، فتح مکہ اور غزوۂ تبوک خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔[4]

---

[1] ابن اسحاق، السيرة النبوية، ص: ۲۲۷ ، ابن سعد، الطبقات الكبرىٰ :۱۴۸/۳

[2] الأحزاب :۳۳/۹۔۲۷

[3] التوبة :۹/۱۲۔۱۶

[4] صحيح البخاري:۳۹۴۹ ، الواقدي ،المغازي :۷/۱، ابن الجوزي، تلقيح فهوم أهل الأثر، ص: ۴۸۔۷۹، ابن سيد الناس، عيون الأثر :۲۲۳/۱، ابن كثير، البداية والنهاية: ۱۵/۴

غزوۂ بدر

مقامِ بدر

مکے اور مدینے کے درمیان ایک چھوٹی سی بستی ہے جسے بدر کہتے ہیں۔ یہ جنگ اسی گاؤں کے قریب ہوئی تھی، اس لیے اس کا نام غزوۂ بدر ہوا۔ یہ غزوہ سن ۲ ہجری میں ہوا تھا۔

بدر ایک بیضوی شکل کا میدان ہے۔ تقریباً پانچ میل لمبا اور چار میل چوڑا۔ اطراف میں پہاڑ ہیں جو دُور سے سفید ریت کے تودے نظر آتے ہیں۔ ان پہاڑوں میں سے ایک کو اَلْعُدْوَۃُ الدُّنْیَا اور دوسرے کو اَلْعُدْوَۃُ الْقُصْوٰی کہتے ہیں۔ ان دونوں کے درمیان ایک بلند پہاڑ ہے جسے جَبَلِ اَسْفَل کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ اس کے پیچھے دس بارہ میل کے فاصلہ پر سمندر ہے۔ مکے سے شام کو جاتے آتے مقام بدر سے گزرنا پڑتا تھا۔[1]

اسباب

قریش مکہ نے مسلمانوں پر مظالم توڑ کر انھیں ہجرت پر مجبور کیا۔ ملک حبش اور مدینے میں پہنچ کر کوشش کی کہ مسلمانوں کو پناہ نہ ملے۔ ہجرت کے بعد مسلمانوں کی جائدادیں اور مکانات ضبط کر لیے۔

ان ناانصافیوں کا بدلہ لینے کے لیے مسلمان مدینے میں بیٹھ کر قریش پر معاشی دباؤ ڈالنا چاہتے تھے اور قریش کے تجارتی قافلوں کو، جو مدینے سے گزر کر ملک شام کو آتے جاتے تھے، روک کر اپنی نئی قوت اور طاقت کا مظاہرہ کر کے انھیں مجبور کرنا چاہتے تھے کہ وہ مدینے سے گزرنے کے لیے مسلمانوں سے اجازت حاصل کریں۔ قریش کو یہ گوارا نہ تھا کہ وہ مسلمانوں

[1] ياقوت الحموي، معجم البلدان: ٣٥٧/١، القزويني، آثار البلاد، ص: ٧٨، أحمد باوزير، مرويات غزوة بدر، ص: ٧٤

کے احسان مند ہوں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب مسلمان قریش کے تجارتی قافلوں کو روکنا چاہتے تو قریش لڑنے مرنے پر تیار ہو جاتے۔ اس سلسلے میں قریش نے کئی مرتبہ چڑھائی کا ارادہ کیا۔ معمولی جھڑپوں میں ایک دو مرتبہ تو قریش کو بڑی زک اٹھانی پڑی۔

اس اجمال کی تفصیل مختصراً یہ ہے:

آنحضرت ﷺ قریش کے حالات بالخصوص ان کے تجارتی اور اقتصادی حالات سے باخبر رہنا بڑا ضروری سمجھتے تھے اور اس مقصد کی خاطر جاسوسی دستے روانہ فرماتے رہتے تاکہ مشرکین مکہ جیسے شدید دشمنوں کے حالات کی اطلاع ملتی رہے۔[1]

حضرت رسولِ کریم ﷺ نے ماہ رمضان سن ۱ ہجری میں حضرت حمزہ بن عَبْد المُطَّلِب رضی اللہ عنہ کو تیس مہاجرین کے ہمراہ بھیجا تاکہ وہ قریش کے ایک قافلے کے بارے میں حالات معلوم کریں اور ضرورت ہو تو اس قافلے کو روکیں۔ ابو جہل کے ساتھ تین سو آدمی تھے۔ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کا ابو جہل سے آمنا سامنا ہو گیا لیکن چند ایک آدمیوں کے بیچ بچاؤ سے بغیر لڑائی کے معاملہ رفع دفع ہو گیا۔[2]

ماہِ ربیع الاول ۲ ہجری میں آپ ﷺ بنفس نفیس قریش اور بنوضَمْرَہ کا قصد کرتے ہوئے موضع وَدّان کی طرف نکلے۔ موضع ودان مدینہ اور مکہ کے درمیان مقام اَبْواء سے آٹھ میل کے فاصلے پر ہے۔ بنوضمرہ نے سمجھوتا کر لیا تو آپ مدینہ واپس تشریف لے آئے۔[3]

ماہِ رَجَب سن ۲ ہجری میں آپ نے حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ کو آٹھ مہاجرین کے ساتھ قریش کے ایک قافلے کے بارے میں اطلاعات حاصل کرنے کے لیے روانہ فرمایا اور رازداری کے پیش نظر ایک خط دے کر حکم دیا کہ دو دن سفر کرنے کے بعد اس خط کو کھولا جائے۔ جب خط کھولا گیا تو اس میں لکھا تھا کہ ”مکہ اور طائف کے درمیان نخلہ کے مقام پر

---

[1] أحمد باوزير، مرويات غزوة بدر، ص: ۹۵

[2] ابن كثير، البداية والنهاية: ۴/ ۲۰، ابن هشام، السيرة النبوية: ۱/ ۵۹۵

[3] ابن هشام، السيرة النبوية: ۱/ ۵۹۱

قیام کرو اور قریش کی دیکھ بھال کر کے ان کے حالات کے متعلق اطلاع دو۔‘‘

یہ مختصر سا جاسوسی قافلہ نخلہ میں جا ٹھہرا۔ وہاں سے قریش کا ایک تجارتی قافلہ عمرو بن حضرمی کی سربراہی میں گزرا۔ مسلمان اس سے الجھ گئے اور قریش کا سالار قافلہ عمرو بن حضرمی مارا گیا اور عثمان بن عبداللہ اور حکم بن کیسان کو گرفتار کر کے قافلے سمیت مدینہ میں لا کر آنحضرت ﷺ کے حضور پیش کر دیا۔ آپ ﷺ بڑے ناراض ہوئے، حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں کو ڈانٹ پلائی کہ تم نے حرمت والے مہینے میں جنگ کی اور خون بہایا، حالانکہ میں نے تمہیں لڑائی کا حکم قطعاً نہ دیا تھا۔‘‘ چنانچہ آپ ﷺ نے اس مال غنیمت کو ہاتھ نہ لگایا اور ان قیدیوں کو رہا کر دیا۔[1]

حکم بن کیسان تو اسلام لے آیا اور مدینہ منورہ میں ہی رہ گیا۔[2]

۲ ہجری میں حضرت رسولِ اکرم ﷺ کو معلوم ہوا کہ قریش کا ایک تجارتی قافلہ ابوسفیان کی سرکردگی میں ملک شام سے آ رہا ہے۔ اس قافلہ میں بے شمار مال و دولت تھی اور یہ وہی قافلہ تھا جسے مکے سے شام جاتے ہوئے مسلمانوں نے روکنا چاہا تھا مگر اتفاقیہ بچ نکلا تھا۔ اب اس قافلے کی واپسی کی اطلاع ملی تو آپ ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مشورہ کیا اور ۳۱۳ جانبازوں اور فدائیوں کو لے کر چل دیے۔

جب ابوسفیان کو خبر ملی تو اس نے قریش مکہ کو اطلاع بھیجی اور وہ ایک ہزار کا لشکر لے کر مسلمانوں سے لڑنے کے لیے نکل پڑے۔ ابوسفیان نے راستہ بدل لیا اور سمندر کے کنارے کنارے مکہ جا پہنچا۔[3]

جب ابوسفیان خطرہ سے بچ کر نکل گیا تو اس نے قریش کو جو مدینہ کی طرف بڑھے چلے جا رہے تھے لکھا کہ واپس آ جاؤ کیونکہ قافلہ بالکل بچ گیا ہے۔ یہ خط ملنے کے بعد

[1] الواقدي، المغازي :۱/۱۳ـ۱۹ ، أحمد باوزير، مرويات غزوة بدر، ص: ۸۶، ابن هشام، السيرة النبوية :۱/۶۰۱ ، ابن كثير، البداية والنهاية :۴/۲۵

[2] ابن الأثير، أسد الغابة :۲/۴۱ ، ابن عبدالبر، الاستيعاب :۱/۴۱۱

[3] ابن الجوزي، الوفا بأحوال المصطفى :۲/۲۲۶ ، ابن هشام ، السيرة النبوية :۱/۶۰۶

قریش لوٹنا چاہتے تھے مگر ابوجہل کہنے لگا کہ ہم بدر تک تو ضرور ہی جائیں گے۔ وہاں اُتر کر آرام کریں گے، عربوں کو خوب کھلائیں پلائیں گے تاکہ ہمارا رُعب اور دبدبہ بیٹھ جائے۔[1]

ادھر قریشِ مکہ غرور و نخوت سے پیش قدمی کر رہے تھے، اُدھر آنحضرت ﷺ کو قریش کے حالات کی اطلاع مل رہی تھی۔ مسلمان بھی آنحضرت ﷺ کی سرکردگی میں آگے بڑھ رہے تھے۔ خدا کی امداد مسلمانوں کے ساتھ تھی۔ مجاہدینِ اسلام تیز تیز بڑھے جا رہے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ابرِ کرم بھیج کر موسم خوشگوار بنا دیا۔

مسلمانوں کی طرف ہلکے سے چھینٹے پڑ گئے۔ سفر میں سہولت ہوگئی۔ کفار کی جانب بارش بڑی تیز اور موسلا دھار تھی، ان کا سفر مشکل ہوگیا۔ مسلمانوں نے پہلے پہنچ کر بدر کے چشمے پر قبضہ کر لیا۔[2]

میدانِ جنگ

قریشِ مکہ کے پاس بڑا ساز و سامان تھا، مسلمانوں کے پاس ہتھیار بھی پورے نہ تھے۔ کافر ایک ہزار کے لگ بھگ تھے، مسلمان صرف ۳۱۳۔ مگر مسلمانوں کے دلوں میں ایمان و اسلام کا جوش اور بازوؤں میں حق و صداقت کا زور تھا۔ ۳۱۳ مخلص فداکاروں نے ایک ہزار کے لشکرِ جرار کو تین تیرہ کر دیا۔[3]

جب مشرکین کے دستے مقابل پر اُترے تو حضرت رسولِ اکرم ﷺ بارگاہِ الٰہی میں سر جھکائے دعا مانگنے لگے:

---

[1] ابن هشام ، السيرة النبوية :١/٦٠٩ ، أحمد باوزير ، مرويات غزوة بدر، ص: ١٣٤، ابن كثير، البداية والنهاية:٤/٥٠، الواقدي،المغازى:١/١٣،١٩

[2] أبو شهبة، السيرة النبوية :٢/١٣٣ ، ابن سيد الناس، عيون الأثر :١/٢٥١

[3] صحيح البخاري : ٣٩٥٦-٣٩٥٩، صحيح مسلم :١٧٦٣، أحمد باوزير، مرويات غزوة بدر، ص: ٣٦١، ابن هشام ، السيرة النبوية :١/٦١٣ ، ابن إسحاق ، السيرة النبوية، ص: ٣١٧، ابن كثير، البداية والنهاية :٤/٥٢

نقشہ غزوۂ بدر
شام کی طرف
العدوۃ الدنیا
اسلامی لشکر
مدینے کا راستہ
بدر کا چشمہ
لشکر قریش
کثیب العقنقل
العدوۃ القصوٰی
مکہ کی طرف
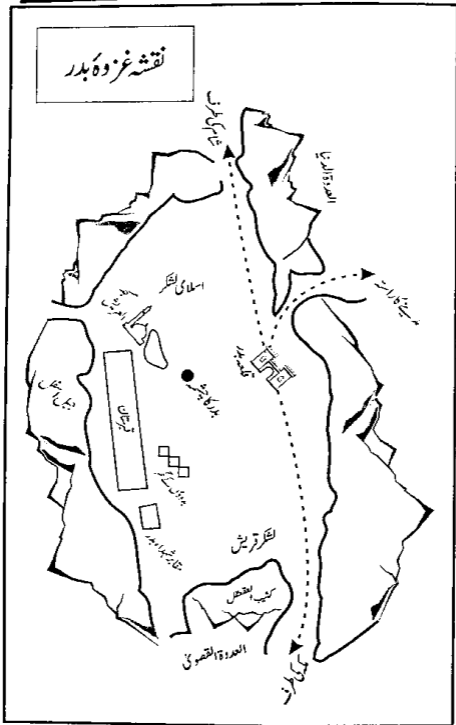
"اے اللہ! یہ قریش اپنے سازوسامان اور فخر وغرور کے ساتھ آ گئے ہیں۔ یہ اس لیے آئے ہیں کہ تیرے ساتھ جنگ کریں اور تیرے رسول کو جھوٹا ثابت کریں۔ اے اللہ! تو نے مجھ سے جو وعدہ کیا ہے پورا کر۔[1] اے اللہ! میں تجھے تیرے وعدے اور عہد کا واسطہ دیتا ہوں۔ اے اللہ! اگر آج یہ تیرے مٹھی بھر بندے مٹ گئے تو پھر زمین پر تیرا نام لینے والا کوئی باقی نہ رہے گا۔"[2]

حضرت رسولِ مقبول ﷺ رات بھر ایک ٹیلے پر نماز میں مصروف رہے۔ یہ جمعہ کی رات اور ۱۷ رمضان سن ۲ ہجری کی تاریخ تھی۔ صبح ہوئی تو دونوں لشکر صف آراء ہوئے۔ آپ ﷺ نے مسلمانوں کی صفوں کو بنفسِ نفیس درست فرمایا۔

جنگ شروع ہوئی تو نصرتِ الٰہی اور تائیدِ غیبی نے مسلمانوں کا ساتھ دیا۔ مسلمانوں نے بہادری کے وہ جوہر دکھائے کہ دشمنوں کے چھکے چھوٹ گئے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ولید کا سر قلم کیا۔ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ نے عُتبہ کو موت کے گھاٹ اتارا۔ انصار کے دو نوجوان ابوجہل کی تاک میں نکلے اور عُقابی شان سے ایسے جھپٹے کہ دیکھتے دیکھتے ابوجہل خاک و خون میں تڑپنے لگا۔ ایک دوسرے مسلمان نے آگے بڑھ کر اس کا سرتن سے جُدا کر دیا۔[3]

ولید، عُتبہ اور ابوجہل کا مارا جانا تھا کہ قریش کا فخر وغرور خاک میں مل گیا۔ ان کے پاؤں اکھڑ گئے اور ہمت ہار کر بھاگنے لگے۔ مسلمانوں نے انھیں مارنا اور پکڑنا شروع کیا۔ قریش کے ستر بڑے بڑے آدمی کھیت رہے، ستر قید ہوئے، باقی جان بچا کر بھاگ نکلے۔ اس جنگ

---

[1] المقريزي، إمتاع الأسماع: ۱/۱۰۱، البيهقي، دلائل النبوة: ۳/۳۵، ابن كثير، البداية والنهاية: ۴/۵۳

[2] صحيح مسلم: ۱۷۶۳، جامع الترمذي: ۳۰۸۱

[3] صحيح البخاري: ۳۹۶۱_۳۹۶۳، أحمد باوزير، مرويات غزوة بدر، ص: ۱۷۴

میں کل چودہ مسلمان شہید ہوئے۔[1]

یہ پہلی شاندار فتح تھی جو مسلمانوں کو نصیب ہوئی۔ جنگ کے بعد حضرت رسولِ اکرم ﷺ اور مسلمان خدا کا شکر ادا کرتے اور فتح کے گیت گاتے مدینے کو واپس ہوئے۔ دشمنوں پر رُعب طاری ہو گیا اور مدینے کے بہت سے کافر مسلمان ہو گئے۔[2] مالِ غنیمت حضرت عبداللہ بن کعب رضی اللہ عنہ کی زیرِ نگرانی مدینے کی طرف روانہ کیا گیا۔ جب مدینے کے قرب و جوار میں پہنچے تو آپ ﷺ نے مسلمانوں میں برابر برابر تقسیم کر دیا۔[3]

کچھ جنگی قیدیوں کو تو فدیہ لے کر رہا کر دیا گیا اور جو فدیہ ادا نہ کر سکے ان کے ذمہ دس دس مسلمان بچوں کی تعلیم کا کام لگا دیا گیا۔ جب وہ دس دس لڑکوں کو لکھنا پڑھنا سکھا چکے تو انھیں بھی چھوڑ دیا گیا۔[4]

جنگِ بدر کے سلسلے میں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ جب حضرت رسولِ مقبول ﷺ جہاد کے لیے نکلے تھے آپ ﷺ کی بیٹی حضرت رُقیہ رضی اللہ عنہا، زوجہ عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ، بیمار تھیں۔ آپ ﷺ ان کی تیمارداری کے لیے حضرت اُسامہ بن زید رضی اللہ عنہ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو پیچھے چھوڑ گئے تھے۔ جب پیغامبر فتح کی خوشخبری لے کر مدینے پہنچا تو حضرت رُقیہ رضی اللہ عنہا کو قبر میں دفن کیا جا رہا تھا۔[5]

غزوۂ بدر کی اہمیّت و نتائج

غزوۂ بدر میں مسلمانوں کی فتح کو سیاسی، تاریخی اور دینی لحاظ سے بڑی اہمیت حاصل ہے۔ جو لوگ قریشِ مکہ کے مظالم سے تنگ آ کر مدینہ میں پناہ گزیں ہوئے اور مشرکین و کفار کے جور و ستم سے بچنے کے لیے وطنِ عزیز کو خیر باد کہہ کر غریب الوطن بنے، ان کی یہ

[1] صحيح مسلم: ١٧٦٣، ابن الأثير، الكامل: ١٣٦/٢

[2] ابن سيد الناس، عيون الأثر: ٢٨٧/١، ابن هشام، السيرة النبوية: ٦٤٣/١، الصالحي، سبل الهدى: ٧٨/٤

[3] ابن هشام، السيرة النبوية: ٦٤٢/١، الزركلي، الأعلام: ١١٥/٤

[4] ابن هشام، السيرة النبوية: ٦٥٩/١، ٦٦٠، ابن سيد الناس، عيون الأثر: ٢٨٦/١

[5] الزركلي، الأعلام: ٣١/٣، الصفدي، الوافي بالوفيات: ٩٥/١٤، ابن عبدالبر، الاستيعاب: ٤٠٠/٤

چھوٹی سی اقلیت آج بڑے بڑے جابر اور ظالم سرداروں کو نیچا دکھانے کے قابل ہوگئی۔ جنگِ بدر کو اس لیے اہمیت حاصل ہے کہ اس میں چند حق پرستوں اور توحید کے ماننے والوں نے مشرکین مکہ اور باطل پرست قوتوں کو زبردست دھکا لگایا۔ اس فتح کے بعد ظلم کا زور ٹوٹ گیا۔ شرک کو خوب جھنجھوڑا گیا۔ کافروں کے حوصلے پست ہو گئے۔ مسلمانوں کے حوصلے بلند ہوئے اور ان کی ہمتیں دوبالا ہوگئیں۔ مسلمان ایک آزاد ملت اور خودمختار اِسلامی حکومت کے معزز شہری بن گئے۔

معرکہ بدر میں اِسلام کی فتح درحقیقت مسلمانوں کی ترقی کا پہلا زینہ تھی۔ یہ فتح اِسلام کی شان و شوکت کا سنگِ بنیاد ثابت ہوئی۔ فتح بدر سے مسلمانوں کا رُعب و دبدبہ قائم ہو گیا۔ مدینہ کے منافق سہم گئے۔ یہودیوں پر بھی مسلمانوں کا رُعب چھا گیا۔ کچھ عرب قبائل جو اَب تک مذبذب تھے، اِسلام کی آغوش میں پناہ لینے لگے۔

فتحِ بدر اِسلام کی صداقت و حقانیت کی بہت بڑی دلیل ثابت ہوئی۔ ۳۱۳ نہتے مسلمانوں نے ایک ہزار کے مسلح لشکرِ جرار کو مار بھگایا۔ حق کو سربلندی نصیب ہوئی اور کفر و شرک کو سرنگوں ہونا پڑا۔ مشرکین مکہ کے بڑے بڑے سردار اور اِسلام کے سخت دشمن مثلاً ابوجہل، عُقبہ، ولید، شَیبہ اور اُمیّہ بن خلف اس جنگ میں مارے گئے۔ ان کے قتل نے کفار کی ہمت توڑ دی اور مسلمانوں کی مخالفت کا زور بھی ٹوٹ گیا۔

فتحِ بدر نے منافقوں کے باطل ارادوں کو خاک میں ملا دیا اور مدینہ کے شریر عناصر بھی دَب کر رہ گئے۔ اس فتح کے بعد یہودیوں کی بد باطنی اور اِسلام دشمنی ظاہر ہوگئی۔ مسلمان ان کے بارے میں زیادہ محتاط ہو گئے اور بعد میں یہی فتح ان کی جلاوطنی کا پیش خیمہ بنی۔

قرآنِ مجید نے اس فتح کا تفصیل سے ذکر کیا اور مالِ غنیمت کی تقسیم وغیرہ کے احکام بتائے۔ نیز بتایا کہ اللہ کا فضل و کرم شامل ہو تو ایمان ہمیشہ کفر پر غالب آتا رہے گا اور اللہ تعالیٰ کی تائید غیبی حق پرستوں کے ساتھ ہوگی۔ حق ہمیشہ غالب رہے گا اور کفر و باطل

مغلوب۔ اللہ کی طرف سے نصرت و اعانت مسلمان کے لیے ہر وقت اتر سکتی ہے۔[1] اس فتح نے یہ بتا دیا کہ قلت و کثرت کو چنداں اہمیت نہیں، بلکہ اہمیت تو نصرتِ غیبی اور تائیدِ الٰہی کو حاصل ہے۔[2]

مختصر یہ کہ بدر کے اس معرکۂ کفر و اسلام میں شرک پرست اور اسلام دشمن عناصر پر بڑی کاری ضرب لگی۔ دشمنانِ اسلام ذلیل و خوار ہو کر خائب و خاسر لوٹے۔ مسلمانوں کو غلبہ اور عزت سے نوازا گیا اور ان کے حوصلے بلند تر ہو گئے۔

---

[1] آل عمران :۳/۱۲۳۔۱۲۶

[2] البقرۃ :۲/۲۴۹

نقشہ غزوۂ اُحُد
خالد بن ولید کی قیادت میں
گھڑ سوار مشرکین کا پیچھے سے چکر کاٹ کر دھاوا
احد پہاڑ
احد پہاڑ
اسلامی لشکر
چشمہ
فوج قریش
خالد بن ولید
مسجد
مدفن حمزہ
جبل رماۃ
(تیراندازوں کی پہاڑی)
وادی قناۃ
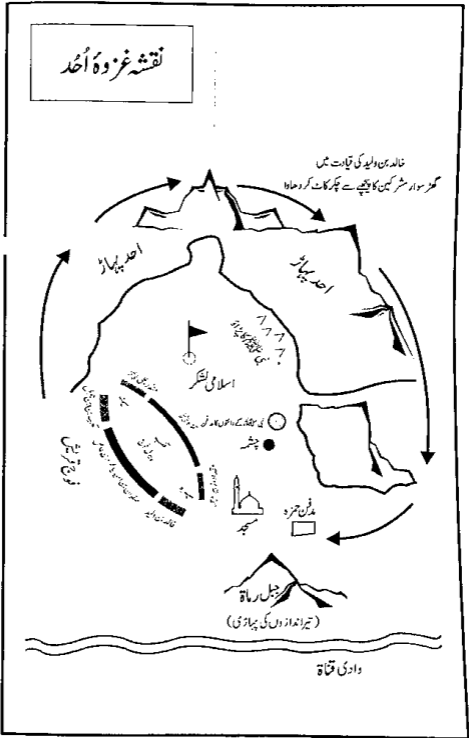
غزوۂ اُحُد

مدینہ منورہ کے شمال میں تقریباً تین میل کے فاصلے پر ایک پہاڑ ہے جسے جبل اُحُد کہتے ہیں۔ یہ پہاڑ شرقاً غرباً پھیلا ہوا ہے۔ جبل اُحُد کے درمیان میں ایک جگہ نیم دائرے یا محراب کی سی شکل کا ایک وسیع میدان بن گیا ہے۔ اُحد کے جنوبی دامن میں وادی قَناۃ ہے۔ وادی قَناۃ کے نیچے یعنی جنوب میں جبلِ عَیْنَین ہے۔ اب یہ جَبَل الرُّماۃ کہلاتا ہے، کیونکہ غزوۂ اُحد میں یہاں تیراندازوں کو متعین کیا گیا تھا۔[1]

جنگِ بدر میں شکست کی بدنامی کا داغ دھونے اور قریش کے بڑے بڑے سرداروں کے قتل کا انتقام لینے کے لیے قریش مکہ نے زبردست تیاری شروع کی۔ ابوسفیان کو سپہ سالار مقرر کیا گیا۔ مشرکینِ مکہ اور عرب قبائل کو مسلمانوں کے خلاف خوب بھڑکایا گیا۔ سال بھر ساز وسامان فراہم ہوتا رہا۔ آخر کار ۳ ہجری میں تین ہزار کا ایک لشکر تیار ہو گیا جس میں سات سو زرہ پوش تھے اور دو سو گھڑ سوار۔ ڈھول، باجے، تاشے، شراب کے مٹکے لشکر کے ساتھ تھے۔ سرداروں کی بیویاں بھی ہمراہ تھیں تاکہ بہادری سے لڑنے پر اُکساتی رہیں۔ قریش کو اپنی طاقت وقوت اور ساز وسامان پر بڑا ناز تھا۔ ابوسفیان تین ہزار کا مسلح لشکر لے کر مسلمانوں پر حملہ کرنے کے لیے مدینے کی طرف چل دیا۔ برق رفتاری سے منزلیں طے کرتے ہوئے لشکر قریش نے مدینے سے آگے بڑھ کر اُحُد پہاڑ کے پاس ڈیرے ڈالے۔[2]

حضرت رسولِ اکرم ﷺ نے پہلے سے جاسوس مقرر فرما دیے تھے۔ جب ابوسفیان

---

[1] یاقوت الحموي، معجم البلدان: ۱/ ۱۰۹

[2] ابن کثیر، البدایة والنهایة: ۱۷۴/۴_۱۷۷، ابن الجوزي، الوفا بأحوال المصطفی: ۲۳۲/۲، تاریخ الطبري: ۴۹۹/۲_۵۰۰، الفاسي، نفائس الدرر: ۵۷۳/۲_۵۷۸

اپنے لاؤلشکر کو لے کر مکے سے روانہ ہوا تھا تو آپ ﷺ کو خبر پہنچ چکی تھی۔ آپ ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مشورہ کیا۔ آخر یہ فیصلہ ہوا کہ شہر سے باہر نکل کر مقابلہ کیا جائے۔[1]

اس فیصلے کے بعد آنحضرت ﷺ اُٹھے اور گھر میں جا کر اپنا جنگی سامان پہن کر باہر تشریف لائے۔ لوگوں کو نماز جمعہ پڑھائی اور جم کر مقابلہ کرنے اور مصائب و آلام کو بہادری کے ساتھ برداشت کرنے کی تلقین فرمائی۔ پھر اپنی فوج کو اُحد کی طرف چلنے کا حکم دیا۔ جب اِسلامی فوج شہر سے باہر جمع ہوئی تو آپ ﷺ نے رضا کارانِ اِسلام کا معائنہ فرمایا، کم عمر بچوں کو واپس بھیج دیا۔[2] البتہ عورتوں کی کچھ تعداد ساتھ رکھی گئی جو لڑائی کے وقت زخمیوں اور دیگر سپاہیوں کی خدمت کرتی رہیں۔ ان میں اُم المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بھی تھیں جو مشکیزے بھر بھر کر پانی لاتیں اور زخمیوں کو پلاتی تھیں۔[3]

مسلمانوں کی تعداد تقریباً سات سو تھی۔ نکلے تو ایک ہزار تھے لیکن منافقوں کا سردار عبداللہ بن اُبَی مسلمانوں میں پھوٹ ڈالنے اور ان کی ہمتوں کو پست کرنے کے خیال سے تین سو ہمراہیوں کو لے کر راستے سے لوٹ گیا۔ صرف ایک سو مسلمانوں کے پاس زِرہیں تھیں۔ پچاس سوار اور پچاس تیر انداز تھے۔[4]

پہلے دن اِسلامی فوج اسی مقام پر ٹھہری رہی جہاں نبی کریم ﷺ نے فوج کا معائنہ کیا تھا۔ شب خون سے بچاؤ کے لیے رات کے وقت پچاس رضا کار گشت کرتے رہے۔[5]

دوسرے دن ہفتہ تھا۔ صبح سویرے ہی اِسلامی فوج نے پیش قدمی شروع کی اور آگے بڑھ کر جبلِ اُحد کے وسیع میدان کے اندر پڑاؤ ڈالا۔ یہ بہترین اور محفوظ ترین جگہ تھی۔ اِسلامی

[1] تاريخ الطبري:٢/٥٠٢،٥٠٤

[2] ابن كثير، البداية والنهاية :٤/١٧٧-١٨٠ ، ابن الجوزي، الوفا بأحوال المصطفى :٢/٢٣٢

[3] صحيح البخاري:٢٨٧٩-٢٨٨٣ ، صحيح مسلم:١٧٩٠، ابن جرير، تاريخ الطبري: ٢/٥٠٥ ، الواقدي، المغازي :١/٢٠٢

[4] ابن الجوزي ، الوفا بأحوال المصطفى :٢/٢٣٢ ، تاريخ الطبري :٢/٥٠٤-٥٠٥

[5] تاريخ الطبري :٢/٥٠٧

لشکر کے پیچھے پہاڑ کی ایک گھاٹی تھی اور یہ ڈر تھا کہ دشمن پیچھے سے وادی قناۃ کے راستے آ کر حملہ نہ کر دے۔ اس حملے کے بچاؤ کے لیے حضرت رسولِ مقبول ﷺ نے پچاس تیر اندازوں کو حضرت عبداللہ بن جُبیر رضی اللہ عنہ کی قیادت و سرکردگی میں حکم دیا کہ وہ اس گھاٹی کی حفاظت کریں اور اپنی جگہ نہ چھوڑیں، خواہ مسلمانوں کو فتح ہو یا شکست۔ انھی تیر اندازوں کی نسبت سے اب اس گھاٹی والے پہاڑ کو جبل الرُّماۃ کہتے ہیں۔[1]

اس دن حضرت رسولِ کریم ﷺ نے دو زرہیں پہن رکھی تھیں اور جھنڈا حضرت مُصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں تھا۔[2] مشرکین مکہ کا سپہ سالار ابوسفیان تھا اور رسالہ کی کمان خالد بن ولید کے ہاتھ میں تھی۔[3]

جب گھمسان کی لڑائی شروع ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی مدد کی۔ کفار نے کئی بار آگے بڑھنے کی کوشش کی مگر ہر مرتبہ منہ کی کھا کر پسپا ہونے پر مجبور ہوئے۔ خالد بن ولید کا رسالہ آگے بڑھا تو مسلمان تیر اندازوں نے خالد کے گھوڑ سواروں کے منہ پھیر دیے۔ مسلمانوں کے شہسوار حضرت زُبیر رضی اللہ عنہ کی سرکردگی میں تیر اندازوں کی معاونت کر رہے تھے۔ خالد کا رسالہ بُری طرح پسپا ہوا، کفار کے پاؤں اُکھڑ گئے، دشمن میدان چھوڑ کر بھاگ نکلا۔[4]

جب گھاٹی والے تیر اندازوں نے کافروں کو بھاگتے دیکھا تو وہ بھی اپنی جگہ چھوڑ کر مال و اسباب لوٹنے کے لیے بھاگے۔ ان کے سردار حضرت عبداللہ بن جبیر رضی اللہ عنہ نے بہتیرا سمجھایا لیکن فتح کی خوشی میں وہاں کون سنتا تھا۔ تیر انداز بھی گھاٹی خالی کر کے مال غنیمت اکٹھا کرنے لگے۔[5]

---

[1] صحيح البخاري:٤٠٤٣، ابن كثير، البداية والنهاية :٤/١٨٠-١٩٣

[2] ابن إسحاق ،السيرة النبوية،ص:٣٣١، ٣٣٤

[3] ابن كثير، البداية و النهاية:٤/١٨٠

[4] سنن أبي داود :٢٦٦٢ ، أبو شهبة ، السيرة النبوية :٢/١٩٣

[5] آل عمران :٣/١٥٢ ،صحيح البخاري:٣٠٣٩، سنن أبي داود :٢٦٦٢

خالد نے گھاٹی کو تیر اندازوں سے خالی پا کر موقع غنیمت سمجھا اور پیچھے سے مسلمانوں پر حملہ کر دیا۔ اس اچانک حملے سے مسلمان گھبرا گئے۔ خالد کا رسالہ مسلمانوں کو تیروں اور نیزوں سے بری طرح زخمی کرنے لگا، مسلمان بڑے پریشان ہوئے۔ پریشانی و اضطراب کے عالم میں مسلمانوں کو بڑا نقصان اٹھانا پڑا۔ پیغمبر خدا ﷺ بھی کفار کے نرغے میں آ گئے لیکن آپ ﷺ نے بڑی بہادری اور استقلال سے مقابلہ کیا۔ کافروں نے یہ مشہور کر دیا کہ حضرت رسالت مآب ﷺ نے جام شہادت نوش فرمالیا ہے۔ اس افواہ نے مسلمانوں پر مایوسی اور اضطراب کا عالم طاری کر دیا اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ پکار اُٹھے:

> ''رسول اللہ ﷺ کے بعد زندہ رہنا بے کار ہے۔ اے مسلمانو! اُٹھو اور آنحضرت ﷺ کی طرح تم بھی خدا کی راہ میں جامِ شہادت نوش کرو۔''[1]

اُدھر چند جاں نثار اور فدا کار آپ ﷺ کے گرد پروانوں کی طرح گھیرا ڈالے کھڑے تھے۔ باوجود اس کے کہ شمع رسالت کے یہ پروانے تیروں اور نیزوں کے خلاف سپر کا کام دے رہے تھے۔[2] آنحضرت ﷺ کا دانت مبارک شہید ہو گیا، آپ ﷺ کے سر مبارک پر زخم آیا۔[3] ستر مسلمان شہید ہوئے۔ آپ ﷺ کے پیارے چچا حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ بھی شہید ہو گئے۔[4]

قریش مکہ نے آپ ﷺ کی شہادت کی افواہ پھیلانے کے بعد فتح کے گمان میں میدانِ جنگ کو چھوڑنا شروع کیا، کچھ لوگ مکہ کو واپس چل دیے۔ آنحضرت ﷺ نے زخمی ہو جانے کے باوجود بڑی ہمت اور بہادری کا ثبوت دیا۔ آپ ڈٹ کر مقابلہ کرتے رہے لیکن

---

[1] ابن كثير، البداية والنهاية: ١٨٩/٤ـ١٩٠، تاريخ الطبري: ٥١٧/٢، ابن الأثير، الكامل: ١٥٦/٢

[2] صحيح البخاري: ٤٠٧٧، صحيح مسلم: ١٧٨٩، مسند أحمد: ١٤٠٥٦، البيهقي، دلائل النبوة: ٢٣٦/٣، ابن كثير، البداية والنهاية: ١٩٥/٤

[3] صحيح البخاري: ٤٠٧٣ـ٤٠٧٦، صحيح مسلم: ١٧٩٠ـ١٧٩٣، ابن الجوزي، الوفا: ٢٣٣/٢

[4] صحيح البخاري: ٤٠٧٢ ـ ٤٠٧٨، ابن الجوزي، الوفا بأحوال المصطفى: ٢٣٤/٢

اتفاق سے آپ ﷺ ایک گڑھے میں گر پڑے۔ صحابہ کرام ؓ نے آپ ﷺ کو اٹھایا اور پہاڑ کے اوپر بلند جگہ پر لے گئے تاکہ مرہم پٹی کریں۔ تھوڑی دیر آرام فرمانے اور حالات کا جائزہ لینے کے بعد آپ ﷺ نے یہ اعلان کرا دیا کہ حضرت رسولِ مقبول ﷺ زندہ وسلامت ہیں۔ آپ کی سلامتی کی خبر سن کر پریشان اور منتشر مسلمان جمع ہونے لگے اور نبی کریم ﷺ پہاڑ کے اوپر جس جگہ آرام فرما رہے تھے وہاں پہنچ گئے۔[1]

اس اجتماع کو دیکھ کر دشمن کے کچھ آدمی مسلمانوں کی طرف بڑھے مگر مسلمان بلندی پر تھے۔ انھوں نے کفار پر سنگ باری کی۔ دشمن بھاگ گئے اور اپنے واپس جانے والے ساتھیوں کے پیچھے مکے روانہ ہوئے۔[2] آنحضرت ﷺ نے حکم دیا کہ مسلمان شہداء کو حضرت حمزہ ؓ کے پاس جمع کیا جائے۔ پھر آپ ﷺ نے ان سب کی نماز جنازہ پڑھی اور انھیں دفن کرنے کا حکم دیا۔[3]

شہیدوں کو دفن کرنے کے بعد اگلے دن آنحضرت ﷺ نے آٹھ دس میل تک دشمن کا تعاقب کیا۔ جب آپ ﷺ کو یقین ہو گیا کہ اب وہ دوبارہ پلٹ کر مدینہ پر حملہ آور نہیں ہوں گے تو آپ ﷺ مدینے واپس آ گئے۔[4]

اس جنگ میں تیئیس کافر مارے گئے تھے۔ کفار اور مشرکین مکہ کی عورتوں نے بھی جنگ میں حصہ لیا۔ وہ اپنے سپاہیوں کو لڑنے پر اُکساتی اور برانگیختہ کرتی تھیں۔[5] ابوسفیان کی بیوی ہند بھی جنگ میں شریک تھی۔ حضرت حمزہ ؓ کی شہادت کے بعد اس نے ان کا پیٹ

---

[1] ابن كثير، البداية والنهاية: ٢٠٩/٤، ابن الأثير، الكامل: ٥٨/٢
[2] ابن هشام، السيرة النبوية: ٩٤/٢
[3] ابن هشام، السيرة النبوية: ٩٧/٢، ابن كثير، البداية والنهاية: ٢١٥/٤
[4] صحيح البخاري: ٤٠٧٧، صحيح مسلم: ٢٤١٨، ابن كثير، البداية والنهاية: ٢٢٧/٤
[5] الواقدي، المغازي: ٢٠٢/١، تاريخ الطبري: ٥٠٥/٢، ابن الأثير، الكامل: ١٤٩/٢، ابن كثير، البداية والنهاية: ١٨٧/٤

چاک کر کے کلیجہ نکال لیا اور منہ میں ڈال کر چبانا چاہا۔[1]

اس جنگ میں مسلمان عورتوں نے بھی بڑی بہادری دکھائی۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے پیارے باپ ﷺ کے زخموں کو دھویا، سر کا خون تھمتا نہ تھا، اس میں چٹائی جلا کر رکھی۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا مشکیزے میں پانی لا کر زخمیوں کو پلاتی تھیں۔[2]

یہ جنگ فیصلہ کن نہ تھی، کوئی فریق ہمت ہار کر میدان نہ چھوڑ گیا تھا۔ نہ کسی فریق کو پوری فتح ہوئی اور نہ کسی کو مکمل شکست، البتہ سبق اور درسِ عبرت دونوں فریقوں کو مل گیا۔ ایک طرف تو مسلمانوں کو تنبیہ کر دی گئی کہ رسولِ خدا ﷺ کی اطاعت و فرمانبرداری میں دین و دنیا کی کامرانی اور سعادت مندی مضمر ہے اور آپ ﷺ کی نافرمانی اور حکم عدولی میں ہلاکت، بربادی اور تباہی ہے۔

دوسری جانب مشرکین اور کفار پر ثابت کر دیا کہ خدا کے رسول ﷺ کو بڑے لاؤلشکر اور ساز و سامان کے باوجود بھی شکست نہیں دی جا سکتی اور یہ کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا بول بالا ہوگا اور فتح و نصرت اور غلبہ مسلمانوں کو حاصل ہوگا۔ البتہ بعض شرارت پسند اور اسلام دشمن عناصر کو یہ جرأت ہوگئی کہ وہ مسلمانوں کے خلاف تخریبی کارروائیاں شروع کر دیں۔[3]

---

[1] صحیح مسلم: ۱۷۹۰، الزركلي، الأعلام: ۹۸/۸، ابن عبدالبر، الاستيعاب: ۴۲۵/۱

[2] صحيح البخاري: ۳۰۳۷ ـ ۲۸۸۰

[3] ابن هشام، السيرة النبوية: ۵۲۷/۱

یہودیوں کا اخراج

یہودی مدتوں سے مدینے میں بستے چلے آ رہے تھے۔ مدینہ اور اس کے آس پاس کے علاقوں میں یہودیوں نے بڑا اقتدار اور اثر ورسوخ حاصل کر لیا تھا۔ تجارت، کاروبار، زراعت، دولت وثروت سب یہودیوں کا اجارہ تھا۔

جب حضرت رسولِ خدا ﷺ مکے سے ہجرت فرما کر مدینے میں تشریف لائے تو آپ ﷺ نے یہودیوں کی سیاسی اور اقتصادی اہمیت کو فوراً بھانپ لیا اور سیاست کاری کے اُصول مدِنظر رکھتے ہوئے یہودیوں کو موقع دیا کہ وہ شریف انسانوں کی طرح اچھے ہمسائے اور معزز شہری ثابت ہوں۔ اسی مقصد کے پیش نظر آپ ﷺ نے سب سے پہلا سیاسی معاہدہ یہود مدینہ سے کیا اور پہلے ہی منشور میں یہودیوں کے حقوق و فرائض کی وضاحت فرما دی۔[1]

اسباب

مگر جب یہودیوں نے دیکھا کہ اِسلام کی قوت روز بروز بڑھ رہی ہے اور مسلمانوں کا سیاسی اقتدار مدینے کی حدود سے نکل کر سارے عرب میں پھیلنے والا ہے تو وہ مسلمانوں کے خلاف سازشوں اور شرارتوں پر اُتر آئے۔ یہودیوں کی اِسلام دشمنی کی وجوہات مندرجہ ذیل تھیں:

۱۔ **مذہبی:** مدت دراز سے یہودیوں کو مدینے میں مذہبی اقتدار حاصل تھا۔ وہ ایک الہامی دین کو مانتے تھے۔ موسوی شریعت کے پیرو تھے۔ ان کے پاس الہامی کتاب تورات موجود تھی۔ مدینے کے مشرک اور بت پرست ان چیزوں سے محروم تھے۔ ان وجوہات کی بنا پر یہودیوں کو اہلِ مدینہ پر احساس برتری کے علاوہ ایک گونہ مذہبی فوقیت حاصل

[1] ابن کثیر، البداية و النهاية: ۳/ ۵۰۳

تھی۔ اِسلام آنے کے بعد یہود کی یہ فوقیت اور اقتدار ختم ہونے لگا۔

۲۔ **اقتصادی:** اِسلام سے پہلے مدینہ اور اس کے آس پاس کے علاقوں کا سارا اقتصادی نظام یہودیوں کے قبضے میں تھا۔ تجارت، صنعت و حرفت، زراعت، لین دین، سودی کاروبار یہودیوں کی ملکیت تھا۔ اہلِ مدینہ یہود کے مقروض تھے۔ اَوس و خزرج آپس میں لڑلڑ کر دم توڑ رہے تھے۔ جب مسلمان ہجرت کر کے مدینے آگئے تو انصار کی ہمدردی اور ایثار نے مہاجرین کے حوصلے بڑھا دیے اور مدینے کے یہ نئے باشندے یعنی مہاجرین تجارت اور کاروبار میں خوب آگے نکل گئے۔ دیکھتے دیکھتے بالکل بے دَست و پا اور فلاکت و افلاس کے مارے مہاجرین دولت و ثروت میں کھیلنے لگے۔ حضرت ابوبکر، حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف اور دوسرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا تجارتی مال غیر ملکی منڈیوں میں آنے جانے لگا۔ یہود مدینہ یہ دیکھ کر حسد کی آگ میں جلنے لگے۔ ان کی تجارت کو ضُعف پہنچا۔ اس سے تجارتی اور اقتصادی رقابت کی آگ بھڑک اُٹھی۔ نیز انصار کی مالی حالت بہتر ہو گئی۔ وہ یہودیوں سے بے نیاز ہو کر تجارت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے لگے۔ یہودیوں کو یہ گوارا نہ تھا کہ ان کی اقتصادی گرفت ڈھیلی ہونے پائے۔ اپنے اقتصادی اقتدار کو خطرے میں دیکھ کر مسلمانوں کی مخالفت پر تُل جانا یہودیوں کے لیے ایک طبعی امر تھا۔

۳۔ **سیاسی:** ہجرت سے پہلے یہودِ مدینہ کو بڑی سیاسی اہمیت حاصل تھی۔ اُنھوں نے اپنے چھوٹے چھوٹے قلعے بنا رکھے تھے۔ اَوس اور خزرج کی باہمی آویزش و لڑائی سے یہودی فائدہ اٹھاتے تھے۔ جب اِسلام مدینہ میں پہنچا تو اس نے اوس اور خزرج کے قبیلوں کو باہم شیر و شکر کر دیا۔ صدیوں کی دشمنی اور عناد کو محبت اور پیار میں تبدیل کر دیا۔ اب مدینے کی سیاست کا مرکزی نقطہ حضرت رسولِ اکرم ﷺ کی ذات بابرکات تھی نہ کہ یہودی۔

معاہدہ مدینہ کی رُو سے یہودی آپ ﷺ کی سیاسی فوقیت و برتری کا اِقرار

کر چکے تھے۔ جنگِ بدر کے بعد مسلمانوں کی سیاسی قوت بڑی تیزی سے بڑھنے لگی۔ یہودی کب گوارا کر سکتے تھے کہ مٹھی بھر پناہ گزین ساری بستی بلکہ سارے ملک کے حکمران بن جائیں۔ مسلمانوں کی ترقی کو روکنے کے لیے یہودی کمربستہ ہو گئے اور مشرکین مکہ سے مل کر اسلام کے خلاف سازشیں کرنے لگے۔

یہودیوں کے تین قبیلے بڑے طاقتور تھے: بنوقَینُقاع، بنونضیراور بنوقُریظہ۔ یہ قبائل سرکشی و اسلام دشمنی میں پیش پیش تھے۔ معاہدۂ مدینہ کی شرائط کے لحاظ سے یہودیوں کا فرض تھا کہ وہ مسلمانوں کی مدد کریں اور دوستی کا ہاتھ بڑھائیں مگر اُنھوں نے عہد شکنی کی۔[1]

بنوقَینُقاع کا اِخراج

ایک دن بنوقینقاع کے بازار میں ایک یہودی نے ایک عرب عورت کو چھیڑا۔ یہ دیکھ کر ایک مسلمان طیش میں آ گیا۔ اس نے یہودی کو قتل کر دیا۔ پھر یہودیوں نے اس غیرت مند مسلمان کو شہید کر دیا۔ حضرت رسولِ اکرم ﷺ نے معاہدے کی رُو سے یہودیوں سے اس شہید کا خون بہا طلب کیا مگر یہودی فساد پر آمادہ تھے۔ قلعہ بند ہو کر مقابلے کے لیے تیار ہو گئے۔ مسلمانوں نے ان کا محاصرہ کر لیا۔ پندرہ دن کے محاصرے کے بعد یہودیوں نے اس شرط پر ہتھیار ڈال دیے کہ حضرت رسولِ اکرم ﷺ جو فیصلہ کریں انھیں منظور ہوگا۔ آپ ﷺ نے انھیں جلاوطن کر دیا اور وہ اپنے باغات، جائیدادیں اور زمینیں چھوڑ کر ملک شام کی طرف چلے گئے۔ یہ واقعہ سن ۲ ہجری کا ہے۔[2]

بنونَضیر کا اخراج

اسی طرح بنونضیر نے بھی معاہدہ مدینہ کی خلاف ورزی کی اور مسلمانوں سے تعاون کرنے کی بجائے دشمنانِ اسلام سے ساز باز کرنے لگے۔ غزوۂ اُحد میں مسلمانوں کا ساتھ نہ دیا۔ پھر جب ایک مرتبہ حضرت رسولِ اکرم ﷺ ایک خون بہا کی رقم کا حصہ وصول کرنے کی

---

[1] ابن هشام، السيرة النبوية: ۵۱۳/۱

[2] ابن الأثير، الكامل: ۱۳۷/۲

غرض سے بنونضیر کی بستی میں تشریف لے گئے، حضرت ابوبکر، حضرت عمر اور حضرت علی رضی اللہ عنہم کے ساتھ آپ ﷺ ایک دیوار کے پاس بیٹھے تھے کہ یہودیوں نے سازش کی کہ اوپر سے ایک پتھر گرا کر آپ ﷺ کو شہید کر دیا جائے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو یہودیوں کے اس ناپاک ارادے کی اطلاع کر دی۔ آپ ﷺ وہاں سے اُٹھے اور مدینے واپس تشریف لے آئے۔

مدینے پہنچ کر آپ ﷺ نے بنونضیر کو لکھ بھیجا کہ معاہدۂ مدینہ کی تجدید و تعمیل کرو اور بصورتِ دیگر مدینے سے نکل جاؤ۔ آپ ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو جمع کیا اور انھیں بتایا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے بذریعہ الہام خبر دی کہ یہودیوں نے میرے قتل کی سازش کی تھی اور مجھے اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم ملا ہے کہ یہودیوں سے جنگ کی تیاری کی جائے۔ جب یہودیوں نے آپ ﷺ کے خط کا کوئی جواب نہ دیا تو آپ ﷺ نے ان کے خلاف لشکر کشی کی۔ یہودی قلعہ بند ہو کر مقابلے کے لیے تیار تھے۔ مسلمانوں نے چھ دن کے محاصرے کے بعد ان کے کھجور کے درختوں کو کاٹ کر نذرِ آتش کر دیا۔ یہودی ڈر گئے اور دو ہفتوں کے محاصرے کے بعد تنگ آ کر ہمت ہار بیٹھے۔ آپ ﷺ کی خدمت میں عرض کرنے لگے کہ جان بخشی دے کر ہمیں جلاوطن کر دیا جائے مگر ہمارا خون نہ بہایا جائے۔ چنانچہ آپ ﷺ نے ان کی درخواست قبول فرما کر اُنھیں جلاوطن کر دیا۔ البتہ اتنی رعایت دی کہ جتنا مال و اسباب اونٹوں پر لاد کر لے جاسکیں لے جائیں۔ بہت سے یہودی تو خیبر میں آباد ہو گئے اور چند آدمی شام کی طرف نکل گئے۔ خیبر مدینے کے شمال میں تقریباً ستر میل کی مسافت پر ہے۔[1]

اسی طرح بنوقُریظہ کو بھی ان کی شرارتوں کی سزا دی گئی[2] جس کا ذکر غزوۂ خندق کے آخر میں آئے گا۔

---

[1] الحشر ۵۹:۱-۵، صحیح البخاري :۴۰۲۸-۴۰۳۲، صحیح مسلم :۱۷۴۶، ابن کثیر، البدایة و النهایة :۴/۲۵۸-۲۶۴، ابن کثیر، الفصول، ص:۱۵۷

[2] صحیح البخاري :۴۱۱۷-۴۱۲۴، ابن سید الناس، عیون الأثر :۱/۶۸

نقشہ غزوہ خندق
الغابہ
فوج قریش
زغابہ
بئر رومہ
جبل ثور
جبل احد
وادی قناۃ
جبل رماۃ
بنی حارثہ
ثنیۃ الوداع
خندق
خندق
لشکر اسلام
جبل سلع
حرہ واقم
مسجد نبوی
بنی ظفر
وادی مہزور
بنی قریظہ کی بستیاں
مسجد قبا
وادی مذینب
بنو نضیر
ذوالحلیفہ
جبل عیر
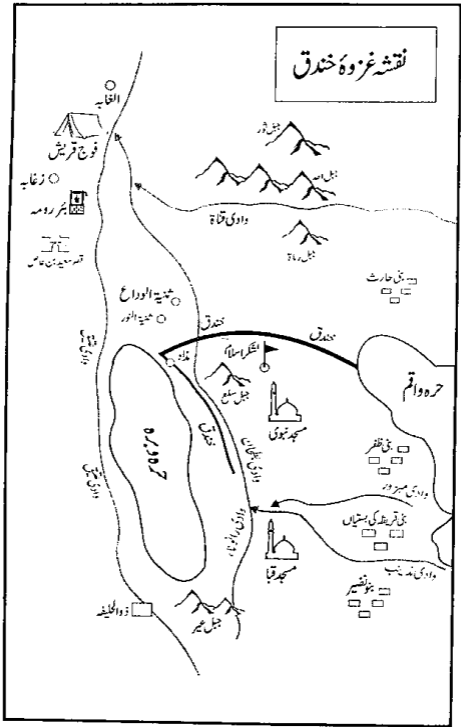
غزوۂ خندق

یہ غزوۂ سن ۵ ہجری میں ہوا۔[1] اس کا دوسرا نام غزوۂ اَحزاب بھی ہے کیونکہ بہت سے گروہ اور قبائل مدینے پر حملہ آور ہوئے تھے۔[2] یہ بھی اہم غزوہ ہے۔ قریش مکہ بنوغطفان اور یہودیوں کے ساتھ مل کر مسلمانوں سے لڑنے آئے تھے۔ ان سب کا سردار ابوسفیان تھا۔[3]

اسباب

اس جنگ کا سبب یہ ہوا کہ یہودیوں کو مدینہ سے نکل جانے کا بڑا دُکھ تھا۔ وہ مسلمانوں سے اس کا انتقام لینا چاہتے تھے۔ اس مقصد کے لیے یہودیوں نے قریش مکہ کے پاس پہنچ کر انھیں مسلمانوں کے خلاف لڑنے پر اُکسایا اور اپنی امداد کا یقین دلایا۔ قریش تو پہلے ہی تیار بیٹھے تھے۔ انھیں گمان تھا کہ جنگِ اُحد میں ان کا پلہ بھاری رہا تھا اور یہ کہ ان میں اتنا دم خم ہے کہ وہ مسلمانوں کو ختم کر سکیں۔ یہودیوں کے اُکسانے اور امداد کے وعدہ سے انھیں اور جراُت ہوگئی۔ پھر بنوغطفان کو بھی آمادہ کر لیا۔ بس پھر کیا تھا، تمام قبیلوں کو ایک جھنڈے تلے جمع کر کے دَس ہزار کا بھاری لشکر بنا کر مدینہ شریف پر دھاوا بولنے کو چل دیے۔[4]

خندق کی تیاری

حضرت رسولِ اکرم ﷺ کو اطلاع پہنچی تو آپ ﷺ نے صحابہ رضی اللہ عنہم سے مشورہ کیا۔ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ ایران کے جنگی طریقوں سے واقف تھے۔ اُنھوں نے مدینہ شریف

[1] ابن كثير، البداية والنهاية: ٤/ ٢٨٢

[2] الأحزاب: ٣٣/ ٢٠۔ اس سورت کا نام سورۂ احزاب اسی وجہ سے رکھا گیا ہے۔ صحيح البخاري: ٣٠، صحيح مسلم: ٤٤

[3] ابن هشام، السيرة النبوية: ٢/ ٢١٥

[4] الواقدي، المغازي: ٢/ ٤٤٢، ابن إسحاق، السيرة النبوية، ص: ٣٩٢، البيهقي، دلائل النبوة: ٣/ ٤٠٨

کے گرد خندق کھودنے کی رائے دی۔[1] حضرت رسولِ اکرم ﷺ نے یہ رائے پسند کرتے ہوئے فرمایا کہ "مجھے بھی بذریعہ الہام خندق کا حکم ملا ہے۔" چنانچہ مسلمان لڑنے کے لیے شہر سے باہر نہیں نکلے بلکہ خندق کھود کر مدینے کے اندر بیٹھ کر مقابلہ کرتے رہے۔ جب خندق کھودنے کی تجویز طے پا چکی تو آنحضرت ﷺ چند مہاجرین و انصار کے ساتھ گھوڑے پر سوار ہو کر نکلے اور شہر کے اطراف و جوانب میں ان جگہوں کا معائنہ فرمایا جو جنگ اور محاصرہ میں اہمیت رکھ سکتی تھیں۔ خندق کھودنے کے لیے نشانات لگا دیے۔ باغات اور مکانات کے علاقے محفوظ تھے۔ ۷ ہ مشرق سے شروع کر کے شمال اور مغرب کے علاقے کو خندق سے محفوظ کرنے کا فیصلہ ہوا۔[2]

خندق کھودنے کا کام شروع ہوا۔ حضرت رسولِ مقبول ﷺ اپنا مکان چھوڑ کر خندق کے متصل پہاڑی پر خیمہ لگا کر مقیم ہو گئے۔ اس خیمے کی یادگار آج تک مسجد ذُباب کی صورت میں موجود ہے۔[3] تین ہزار مہاجرین و انصار مل کر خندق کھودنے لگے۔[4] حضرت رسولِ اکرم ﷺ بھی اپنے مبارک ہاتھوں سے خود خندق کھود رہے تھے۔[5] کئی کئی دن فاقے سے گزر رہے تھے مگر حوصلے مضبوط تھے اور ہمتیں بلند۔ صحابہ رضی اللہ عنہم بڑی محنت سے مٹی کھودتے اور جوش کے عالم میں حسبِ ذیل شعر پڑھتے (جن کا ترجمہ یہ ہے):

"ہم نے حضرت رسولِ اکرم ﷺ کے ہاتھ پر اس بات کی بیعت
کی ہے کہ جب تک جان میں جان ہے، ہم خدا کی راہ میں لڑتے

---

[1] ابن هشام ، السيرة النبوية:۲/۲۲٤ ، الواقدي ، المغازي :۲/٤٤٥، تاريخ الطبري :۲/٥٦٦، أبو شهبة، السيرة النبوية :۲/۲۷۷

[2] ابن جرير،تاريخ الطبري :۲/٥٦۷ ، الصالحي، سبل الهدى :٤/٣٦٥ ، الواقدي، المغازي: ۲/٤٤٥، المقريزي، إمتاع الأسماع :۱/۲۲٥

[3] الواقدي ،المغازي :۲/٤٥٠ ، السخاوي ، التحفة اللطيفة :۱/۳۹

[4] الواقدي، المغازي :۲/٤٥٣

[5] صحيح البخاري :۲۸۳٤ـ ٤۰۹۸ـ ٤۱۰۰ ، صحيح مسلم:۱۸۰۳

رہیں گے۔"[1]

محاصرۂ مدینہ

اِدھر شوال سن ۵ ہجری میں تین ہفتوں کی مسلسل محنت کے بعد خندق تیار ہوئی۔ شمال اور مغرب کے غیر محفوظ اطراف میں تقریباً آٹھ ہزار گز لمبی خندق کھود کر مدینے کو محفوظ کر لیا گیا۔ اُدھر دشمن کے لشکر نے آ کر شہر کا محاصرہ کر لیا۔[2] آنحضرت ﷺ نے عورتوں اور بچوں کو گڑھیوں اور چھوٹے قلعوں میں بھیج دیا[3] اور خود پوری فوج کے ساتھ سَلع پہاڑ پر ڈیرے ڈالے۔[4] آپ ﷺ اپنے الگ خیمے میں بیٹھ کر دشمنوں کی نقل وحرکت کی دیکھ بھال کرنے لگے۔ آپ ﷺ کے اس خیمے کی یادگار مسجد الفتح کی شکل میں اب تک موجود ہے۔[5]

مسلمانوں کے فوجی دستے باری باری خندق کی نگہبانی کرتے اور پہرہ دیتے تھے۔[6] جب کبھی دشمن خندق کے کسی مقام پر حملہ آور ہوتا تو مسلمان فوج تیروں سے استقبال کرتی۔[7] دشمن کے سوار بھی خندق کے پار منڈلاتے رہتے اور موقع کی تلاش میں رہتے۔ بعض لوگ خندق پار کرنے کی کوشش میں کھائی میں گر کر ہلاک ہو گئے۔[8] ایک آدھ مرتبہ دشمن کے بعض سردار اپنے عمدہ گھوڑوں کو خندق کُدانے میں کامیاب ہو گئے، لیکن مسلمانوں نے اُن کا کام

---

[1] صحيح مسلم: ١٨٠٥

[2] ابن كثير، البداية والنهاية: ٢٩٥/٤ ، ابن هشام ، السيرة النبوية: ٢١٩/٢

[3] ابن هشام ، السيرة النبوية: ٢٢٨/٢ ، ابن الأثير، الكامل: ١٨٠/٢

[4] ابن كثير، البداية والنهاية: ٢٩٥/٤، ابن هشام ، السيرة النبوية: ٢٢٠/٢

[5] السخاوي ، التحفة اللطيفة: ٤٠/١ ، قطب الدين الحنفي ، تاريخ المدينة، ص: ١٣٤، الواقدي، المغازي: ٤٥٤/٢

[6] الواقدي ، المغازي: ٤٥٧/٢

[7] ابن هشام ، السيرة النبوية: ٢٢٢/٢، ابن كثير، البداية والنهاية: ٢٩٧/٤ ، الواقدي، المغازي: ٤٥١/٢، ٤٦٤

[8] الواقدي ،المغازي: ٤٧٣/٢ ، ابن سيد الناس ، عيون الأثر: ٦٢/٢

تمام کر دیا۔[۱]

جُوں جُوں محاصرہ لمبا ہوتا گیا مسلمانوں کی تکلیف بڑھتی چلی گئی۔ پندرہ بیس دن کے محاصرے کے بعد دشمنوں نے بڑا زور مارا لیکن منہ کی کھا کر نامراد و ناکام لوٹے۔[۲]

یہودیوں نے موقع تاڑ کر مسلمان خواتین کے کیمپ پر حملہ کرنے کی کوشش کی لیکن مسلمان عورتوں نے بڑی بہادری اور جرأت سے کام لے کر یہودیوں کو مار بھگایا اور ایک آدھ کو تو قتل بھی کر دیا۔ اس سے یہودی خوفزدہ ہو گئے اور سمجھے کہ قلعہ کے اندر بھی مسلمانوں کی فوج موجود ہے۔[۳]

اُدھر قریش نے یہود بنو قریظہ کو آمادہ کر لیا تھا کہ وہ پچھلی جانب سے مسلمانوں پر حملہ کر دیں۔[۴] اِدھر محاصرے کی طوالت اور حالات کی نزاکت کے پیش نظر آنحضرت ﷺ نے ضروری سمجھا کہ سیاسی بصیرت اور جنگی حربہ استعمال کیا جائے اور افواہیں پھیلا کر دشمن کی صفوں میں پھوٹ ڈلوائی جائے۔[۵] یہ موقع بھی بڑا اچھا تھا کیونکہ محاصرہ کرنے والی فوج کا راشن ختم ہونے کو تھا، رَسد پہنچنے کی اُمید نہ تھی۔[۶]

حضرت رسولِ مقبول ﷺ نے نُعَیم بن مسعود رضی اللہ عنہ جن کا اِسلام لانا ابھی مشہور نہ ہوا تھا، کو بنو قُریظہ کے پاس بھیج کر مسلمانوں کی قوت و طاقت اور فتح و کامیابی کا ان کو یقین دلایا اور سمجھایا کہ وہ پیغمبر خدا ﷺ سے خواہ مخواہ جھگڑا مول نہ لیں اور یہود کو یہ بھی اشارہ کیا کہ وہ قریش سے اس بات کی ضمانت لیں کہ وہ جنگ کو آخر تک جاری رکھیں گے اور اس

---

[۱] ابن كثير، البداية والنهاية :٤/٢١٨، ابن هشام ، السيرة النبوية:٢/٢٢٤، الواقدي ،المغازي: ٢/٤٧٠

[۲] تاريخ الطبري:٢/٥٧٢

[۳] ابن هشام ، السيرة النبوية :٢/٢٢٨، ابن الأثير، الكامل :٢/١٨٢

[۴] ابن كثير، البداية والنهاية:٤/٣٠٢

[۵] ابن إسحاق ، السيرة النبوية :٤٠٥

[۶] ابن إسحاق ، السيرة النبوية :٤٠٧

ضمانت میں قریش کے سردار اور معزز لوگ اپنے پاس رکھیں، یہ مشورہ یہود کو پسند آیا۔ جب قریش کو اس کا علم ہوا تو انھیں یہودیوں کی دیانت پر شک ہونے لگا اور وہ یہ سمجھے کہ بنو قریظہ نے مسلمانوں سے کچھ ساز باز کر لی ہے۔ مسلمانوں نے اس قسم کی افواہوں کو خوب ہوا دی۔ آہستہ آہستہ ان افواہوں کا یہ اثر ہوا کہ قریش کو یقین ہو گیا کہ یہودیوں نے مسلمانوں سے کوئی سمجھوتہ کر لیا ہے۔ بس پھر کیا تھا، یہودیوں اور مشرکین مکہ میں پھوٹ پڑ گئی۔[1]

ایک طرف تو دشمنوں میں پھوٹ پڑ گئی، یہودی قریش کو شک و شبہ کی نظروں سے دیکھنے لگے اور قریش مکہ یہودیوں سے بدظن ہو گئے۔ دوسری طرف اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی مدد فرمائی اور آندھی کا ایسا ہولناک طوفان بھیجا کہ کفار سخت پریشان ہو گئے۔ شدت کی آندھی اور سخت سردی نے ان کے ہوش و حواس گم کر دیے۔[2] مدینے کے ارد گرد ایک مہینے تک ڈیرے ڈالے رہنے کے بعد قریش کو ناکام و نامراد واپس جانا پڑا۔[3]

ناکامی کے اسباب

اس محاصرہ کی ناکامی کے اسباب حسب ذیل تھے:

۱۔ مسلمان متحد اور یک جان تھے۔ ان کے سامنے ایک مقدس مقصد تھا، یعنی دین اور عقیدے کی حفاظت۔ وحدتِ عقیدہ اور وحدتِ عمل نے مسلمانوں کے حوصلے بلند کر رکھے تھے۔ انھیں اپنے قائد اور سربراہ پر پورا اعتماد تھا۔ اس کے مقابلے میں دشمنانِ اِسلام میں نہ تو وحدتِ عقیدہ موجود تھی اور نہ وحدتِ عمل۔ ان کا لشکر مختلف الخیال عناصر سے مرکب تھا۔ ان میں باہمی اعتماد بھی مفقود تھا۔

۲۔ مسلمانوں نے اس مرتبہ خندق کھود کر اپنی اور شہر کی حفاظت کا بڑا مضبوط بندوبست کر

---

[1] الكامل: ۱۸۲/۲، ابن إسحاق، السيرة النبوية، ص: ٤٠٥، ابن هشام، السيرة النبوية: ۲۲۹/۲، الواقدي، المغازي: ٤٨٠/٢

[2] الأحزاب: ۹/۳۳، ابن كثير، البداية والنهاية: ۳۰۸/٤

[3] الأحزاب: ۲٥/۳۳، الواقدي، المغازي: ٤٩١/٢، ابن إسحاق، السيرة النبوية، ص: ٤٠٧

رکھا تھا۔ خندق کا تصور عربوں کے لیے بالکل انوکھا تھا۔ دشمن خندق دیکھ کر نہ صرف حیران ہوئے بلکہ ان کے حوصلے بھی پست ہو گئے۔

۳۔ طویل محاصرے کے بعد بھی کامیابی کی کوئی کرن نظر نہ آئی۔ مسلمان مجاہدوں نے دشمنوں کی ہر کوشش کو ناکام بنا دیا اور ہر مرتبہ منہ توڑ جواب دیا۔

۴۔ دس ہزار[1] اور بقول بعض مؤرخین چوبیس ہزار کے لشکرِ جرار کے لیے رَسَد کا فراہم کرنا بذاتِ خود ایک بہت بڑا مسئلہ تھا۔ سامانِ رسد کی قلت نے حملہ آوروں کے لیے تشویش ناک صورت اختیار کر لی تھی۔ دشمنوں کی عددی قوت ہی ان کی بڑی کمزوری کا سبب بن گئی۔ مسلمانوں کی جفاکوشی اور صبر کی وجہ سے یہ مسئلہ ان کے لیے کوئی بہت اہم نہ تھا۔

۵۔ دورانِ محاصرہ موسم غیر معمولی طور پر حملہ آوروں کے لیے پریشان کن ثابت ہوا۔ شدت کی سردی اور ہولناک طوفان، بادو باراں نے حملہ آوروں کی رہی سہی ہمت بھی توڑ دی اور وہ بددل ہو کر محاصرہ اٹھانے پر مجبور ہو گئے۔

۶۔ رسول اللہ ﷺ کی حکمت عملی، جنگی مہارت اور سیاسی تدبر نے دشمنوں کی صفوں میں انتشار پیدا کر کے پھوٹ ڈلوا دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ قریش بنو غطفان سے بدظن ہو گئے اور بنو غطفان ان سے۔ اسی طرح قریش اور بنو قُریظہ کے درمیان بھی منافرت اور بداعتمادی خوب پھیل گئی۔ دشمن آپس میں ایک دوسرے کو مشکوک نظروں سے دیکھنے لگے۔

غزوۂ خندق کی اہمیّت

غزوۂ خندق یا جنگِ احزاب اِسلام کے خلاف کفر وشرک کا آخری جارحانہ اقدام تھا۔ مدینہ منوّرہ میں ایک چھوٹی سی نو عمر اِسلامی ریاست کو دیکھ کر کفر وشرک کے ایوانوں میں آگ لگ گئی اور وہ شمع رسالت کو بجھانے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا بیٹھے، لیکن ہر بار منہ کی کھا کر

[1] ابن کثیر، البدایة والنهایة: ۲۹۵/۴، ابن الجوزي، الوفا بأحوال المصطفی: ۲۳۷/۲

ناکام ونامراد واپس لوٹے۔
اس مرتبہ ایک عظیم الشان لشکر جمع کر کے قریش اپنے حلیف قبائل کے ساتھ مدینہ منورہ پر حملہ آور ہوئے۔ دشمن کی اتنی بڑی تعداد مسلمانوں کو حرفِ غلط کی طرح مٹانے پر تلی ہوئی تھی لیکن تائید ایزدی اور نصرت الٰہی نادار اور کمزور مسلمانوں کے ساتھ تھی۔
قریش مکہ کی یہ آخری کوشش بھی کارگر نہ ہو سکی۔ میدانِ جنگ میں ناکامی نے انھیں اعتمادِ نفس سے محروم کر دیا۔ مختلف جماعتوں نے مل کر محاذ بنایا لیکن خود ہی ان کی صفوں میں انتشار پھیل گیا۔ اس غزوہ کی بدولت یہود بنی قُریظہ کی اصلیت بے نقاب ہو کر سامنے آ گئی اور اُنھیں مسلمانوں سے بے وفائی اور غداری کا عبرتناک سبق مل گیا۔

یہودیوں کی سزا

کفار کی ناکام واپسی کے بعد حضرت رسولِ اکرم ﷺ شہر میں واپس تشریف لائے اور ہتھیار کھولنے لگے تھے کہ خدا تعالیٰ نے حکم بھیجا کہ یہودیوں کو وعدہ خلافی اور غداری کی سزا دو۔[1] یہ حکم ملتے ہی منادی کرادی کہ ہر فرمانبردار مسلمان نمازِ عصر سے پہلے پہلے بنوقریظہ کے علاقے میں پہنچ جائے۔[2] آپ ﷺ خود بھی فوراً روانہ ہو گئے۔[3]
مسلمانوں کا لشکر دیکھ کر یہودی ڈر گئے اور عہد شکنی اور غداری کی معافی مانگنے لگے، مگر چونکہ سزا دینے کا حکم آ چکا تھا اس لیے معافی کا سوال ہی پیدا نہ ہوا۔ پندرہ دن تک مسلمانوں نے بنوقریظہ کا محاصرہ جاری رکھا۔ بالآخر یہودیوں نے مجبوراً غیر مشروط طور پر ہتھیار ڈال دیے۔ انصارِ اوس میں سے کچھ لوگ ان کو معاف کر دینے کے حق میں تھے۔[4]
حضرت رسولِ اکرم ﷺ نے یہودیوں کا معاملہ قبیلہ اوس کے سردار حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ

---

[1] صحيح البخاري:٤١١٧-٤١١٨، صحيح مسلم :١٧٦٩، ابن هشام، السيرة النبوية:٢/٢٣٣
[2] صحيح البخاري:٤١١٩، ابن الأثير، الكامل :٢/١٨٥
[3] صحيح البخاري :٤١١٧
[4] ابن الجوزي، الوفا بأحوال المصطفى :٢/٢٣٩

کے سپرد کردیا کہ جو فیصلہ وہ کریں اسے نافذ کردیا جائے۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے فیصلہ کیا کہ عورتوں اور بچوں کو قیدی بنالیا جائے اور مردوں کو قتل کردیا جائے اور ان کی جائیداد اور مال و دولت کو بطور غنیمت تقسیم کرلیا جائے۔[1] چنانچہ سات سو کے قریب یہودی قتل کردیے گئے۔[2] ان مقتولوں میں ایک عورت بھی تھی جس نے ایک مسلمان خلاد رضی اللہ عنہ کو چکّی سے شہید کردیا تھا۔ یہ عورت حضرت خلاد بن سوید رضی اللہ عنہ کے قصاص میں قتل ہوئی۔[3] اسی طرح بنونضیر کا سردار حیی بن اَخطب بھی ان غداروں کے ساتھ مارا گیا۔ کیونکہ وہ بنوقریظہ کے پاس آکر سازشوں اور شورشوں کی سوچا کرتا تھا اور اسی کے کہنے پر بنوقریظہ نے عہدشکنی کی تھی۔[4]

سزا کی وجوہات

بنوقریظہ کو یہ سزا اس لیے ملی کہ اُنھوں نے مسلمانوں سے تعاون و دوستی کا عہد و پیمان کرنے کے بعد بدعہدی اور بے وفائی کی۔ یہود بنوقریظہ مسلمانوں کے حلیف اور معاہد تھے۔ معاہدے کی رُو سے یہودیوں پر لازم تھا کہ وہ بیرونی حملے کے وقت مسلمانوں کی اعانت اور امداد کرتے لیکن اُنھوں نے اپنے حلیف گروہ یعنی مسلمانوں کو بیرونی حملہ آوروں کے مقابلے کے لیے تنہا چھوڑ دیا، بلکہ خود غیر جانب دار بھی نہ رہے، کُھلَم کُھلّا قریش مکہ کا ساتھ دیا اور کئی مرتبہ کوشش کی کہ مسلمانوں اور ان کے پیغمبر علیہ السلام کو غداری اور اچانک حملے سے ہراساں اور پریشان کریں۔

پھر یہ کہ جلاوطن شدہ قبیلے کے سردار حُیَیّ بن اخطب کو اپنے ساتھ مدینہ لے آئے، جس سے مسلمان اور بھی برافروختہ ہوئے۔ مزید برآں ندامت و افسوس کا اظہار کرنے کی بجائے یہود بنوقریظہ مسلمانوں سے مقابلے کے لیے تیار ہو گئے۔ ان تمام

---

[1] صحيح البخاري: ٤١٢١-٤١٢٢، صحيح مسلم: ١٧٦٨، ابن كثير، البداية والنهاية: ٣٢٢/٤

[2] ابن كثير، البداية والنهاية: ٣٢٣/٤، ابن هشام، السيرة النبوية: ٢٤١/٢، ابن الجوزي، الوفا بأحوال المصطفى: ٢٣٩/٢

[3] الصفدي، الوافي بالوفيات: ٢٣٢/١٣، ابن سيد الناس، عيون الأثر: ٧٣/٢

[4] ابن كثير، البداية والنهاية: ٣٢٣/٤، الزركلي، الأعلام: ٢٩٢/٢

وجوہات کا تقاضا یہ تھا کہ ایسی بد باطن و بدعہد اور غدار قوم کو ایسی ہی عبرتناک سزا ملے۔ بنوقریظہ سے نمٹنے کے بعد اب مدینہ منورہ یہود کی سازشوں سے پاک ہو گیا۔

غزوہ بنی مُصطَلق ۵ھ

اس جنگ کو غزوۂ مُرَیسیع بھی کہتے ہیں، کیونکہ یہ جنگ ایک چشمے کے قریب ہوئی تھی جسے مریسیع کہتے تھے۔[1] بنومصطلق بن خُزاعہ نے اپنے سردار حارث بن ابی ضرار کی سرکردگی میں مسلمانوں سے جنگ کی ٹھانی۔ جب آنحضرت ﷺ کو معلوم ہوا تو سن ۵ ہجری میں آپ نے لشکر لے کر ان پر چڑھائی کر دی۔[2]

بنومصطلق کو شکست ہوئی اور ان کے بہت سے مرد مارے گئے۔ عورتیں اور بچے جنگی قیدی بنا لیے گئے۔[3]

اس غزوے کی ایک بڑی اہمیت یہ ہے کہ بنومصطلق کے سردار حارث بن ابی ضرار کی بیٹی حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا آنحضرت ﷺ کے نکاح میں آئیں۔ آپ ﷺ نے اس قبیلے کے سردار کی بیٹی کی عزت افزائی کی خاطر اسے ثابت بن قیس سے، قید ہو جانے کے بعد، آزادی دلوا کر اپنے نکاح میں لے لیا۔[4]

جب بنومصطلق آنحضرت ﷺ کے سسرال ٹھہرے تو اس تعلق مصاہرت کی تعظیم کرتے ہوئے تمام صحابہ رضی اللہ عنہم نے اپنے اپنے جنگی قیدیوں کو رہا کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بنومصطلق نے اسلام قبول کر لیا۔[5]

---

۱ صحیح البخاري: ۳۳ ، یاقوت الحموي، معجم البلدان: ۱۱۸/۵

۲ ابن هشام ، السيرة النبوية : ۲۹۰/۲

۳ صحیح البخاري: ۲۵٤۱

٤ صحیح مسلم: ۱۷۳۰ ، الزرکلي، الأعلام: ۱٤۸/۲ ، الصفدي ، الوافي بالوفيات : ۱۷٤/۱۱

۵ ابن کثیر، البداية والنهاية : ۳٦۹/٤ ، ابن هشام ، السيرة النبوية : ۲۹۵/۲

اس موقع پر انصار ومہاجرین میں ایک معمولی سی بات پر تنازع ہوگیا اور قریب تھا کہ تلوار چل جائے، آنحضرت ﷺ کی بروقت مداخلت سے تلوار چلتے چلتے رُک گئی۔ آپ ﷺ نے لوگوں کو ڈانٹ دیا اور پھر کبھی ایسی حرکت کرنے سے روک دیا۔[۱]

نیز اس غزوے سے واپسی پر حضرت عائشہ صدیقہ ؓ کا قصہ اِفک پیش آیا جس کی وجہ سے اُم المومنین حضرت عائشہ صدیقہ ؓ کو چند دن سخت پریشانی اور بے چینی رہی۔ آخر اللہ تعالیٰ نے سورۃ النور میں برأت نازل کرکے ساری بات صاف اور واضح کردی اور تہمت کی سخت تردید کرکے تہمت لگانے والوں کے لیے سزا مقرر کردی۔[۲]

---

[۱] صحيح البخاري:٤٩٠٥، صحيح مسلم :٢٥٨٤ ، مسند أحمد :١٥٢٢٣، ابن سيد الناس، عيون الأثر: ٩٣/٢، تاريخ الطبري :٦٠٥/٢

[۲] النور :١١/٢٤-٢٥ ، صحيح البخاري :٢٦٦١، ٤١٤١، ٤٧٥٠ ، ابن كثير، البداية والنهاية: ٣٧٠/٤-٣٧٥

صُلحِ حُدَیْبِیَہ

ماہ ذوالقعدہ سن ۶ ہجری میں حضرت رسولِ اکرم ﷺ چودہ سو مسلمانوں کو ساتھ لے کر خانہ کعبہ کی زیارت کے لیے مکہ روانہ ہوئے۔ خانہ کعبہ کی اس زیارت کو عُمرہ یعنی چھوٹا حج کہتے ہیں۔[1]

مسلمانوں کے پاس تلواروں کے سوا اور کوئی ہتھیار نہ تھا۔[2] آنحضرت ﷺ نے ایک جاسوس پہلے سے بھیج دیا تھا تاکہ قریش کے حالات سے اطلاع ملتی رہے۔ جاسوس نے خبر دی کہ قریش جنگ کے لیے تیار ہیں، آپ ﷺ سے لڑیں گے اور خانہ کعبہ کی زیارت سے روکیں گے۔[3]

آنحضرت ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مشورہ کیا۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے رائے دی کہ لڑائی کرنے میں پہل نہ کی جائے، اگر کوئی راستہ روکے تو پھر جنگ کی جائے۔ آنحضرت ﷺ نے یہ رائے پسند فرمائی اور آگے بڑھے۔[4]

قریش نے خالد بن ولید کو ہراول دستہ دے کر بھیجا تھا۔ خالد نے مسلمانوں کو دیکھا تو ڈر گیا اور دوڑا دوڑا مکے پہنچا اور قریش کو خبر دی تو قریش یہ سن کر بڑے گھبرائے۔[5] آنحضرت ﷺ بڑھتے چلے گئے، یہاں تک کہ آپ ﷺ حدیبیہ کے قریب پہنچ گئے۔

---

[1] ابن الجوزي، الوفا بأحوال المصطفى :۲/ ۲٤۰ ، ابن كثير، البداية والنهاية :٤/ ۳۷٦

[2] الواقدي، المغازي :۲/ ۵۷۲

[3] ابن الجوزي، الوفا بأحوال المصطفى :۲/ ۲٤۰

[4] صحيح البخاري :٤۱۷۸، ٤۱۷۹ ، مسند أحمد :۱۸۹۲۸ ،الصالحي،سبل الهدى :۵/ ۳۷

[5] مسند أحمد :۱۸۹۲۸

حدیبیہ ایک کنواں ہے جو مکے سے ایک منزل پر واقع ہے۔ یہاں قریش راستہ روک کر کھڑے ہو گئے۔[۱] آنحضرت ﷺ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو یہاں سے یہ پیغام دے کر بھیجا کہ ہم لڑنے کے لیے نہیں آئے، ہم تو خانہ کعبہ کی زیارت کے لیے آئے ہیں، ہمیں اور کوئی کام نہیں ہے، بہتر یہ ہے کہ ہمیں نہ روکو۔

قریش نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی باتوں پر کان نہ دھرے اور ان سے کہا کہ تم طواف کرلو، مگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ یہ بات کیسے منظور کر لیتے۔[۲]

بیعتِ رضوان

صلح کی بات چیت شروع ہوتے ہوتے پھر جھگڑا پیدا ہو گیا۔ دونوں طرف سے پتھر اور تیر برسائے گئے۔[۳] اسی دوران میں آنحضرت ﷺ کو خبر ملی کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو شہید کر دیا گیا ہے۔ یہ خبر سن کر مسلمانوں کو بڑا غصہ آیا۔ وہ مرنے مارنے پر تیار ہو گئے۔ سب نے ایک درخت کے نیچے حضرت رسولِ اکرم ﷺ کے ہاتھ پر بیعت کی کہ ہم دشمنوں کے مقابلہ پر لڑیں گے اور کسی حالت میں نہ بھاگیں گے۔ اس کا نام بیعتِ رضوان ہے۔[۴]

معاہدۂ صُلح

اللہ کا کرنا دیکھیے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ جلد ہی مکے سے صحیح سلامت واپس آ گئے۔ ان کو دیکھ کر جوش ٹھنڈا ہو گیا اور صلح کی بات چیت پھر سے شروع ہوئی۔ جب شرطیں طے ہو چکیں تو آنحضرت ﷺ نے کاتب کو بلا کر فرمایا کہ لکھو "بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ" قریش کے نمائندے سُہیل بن عمرو نے اعتراض کیا کہ ہم رحمٰن کو نہیں جانتے۔ یہ سن کر مسلمان

---

۱ ابن كثير، البداية و النهاية: ٣٧٧/٤

۲ ابن هشام ، السيرة النبوية :٣١٥/٢ ، ابن إسحاق ، السيرة النبوية، ص: ٤٦٠

۳ ابن هشام ، السيرة النبوية :٣١٤/٢ ، تاريخ الطبري :٦٣١/٢

۴ الفتح :١٨/٤٧ ،ابن هشام ، السيرة النبوية :٣١٥/٢ ، ابن إسحاق، السيرة النبوية، ص: ٤٦٠

خفا ہوئے مگر آنحضرت ﷺ صلح کرنا چاہتے تھے، اس لیے آپ ﷺ نے فرمایا کہ قریش کے دستور کے مطابق "بِاسْمِكَ اللّٰهُمَّ" لکھ دو۔ جب آپ ﷺ نے "مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللّٰہِ" لکھوانا چاہا تو پھر سہیل بن عمرو نے اعتراض کر دیا کہ ہم تو آپ کو اللہ کا رسول نہیں مانتے، اگر ہم یہ بات مان لیتے تو یہ جھگڑا ہی کیوں ہوتا؟ اس پر مسلمان تو بہت ناراض ہوئے مگر آپ ﷺ نے محمد بن عبداللہ لکھوا دیا۔[1]

شرائطِ صلح

صلح حدیبیہ کی شرطیں یہ تھیں:

۱۔ دس سال تک فریقین میں لڑائی جھگڑا بند رہے گا اور امن وامان قائم رکھا جائے گا۔

۲۔ مسلمان اس سال واپس جائیں اور اگلے سال آ کر خانہ کعبہ کی زیارت کریں مگر تین دن سے زیادہ نہ ٹھہریں۔

۳۔ مسلمان اپنے ساتھ تیر اور نیزے بالکل نہ لائیں۔ صرف تلواریں لا سکتے ہیں اور وہ بھی نیاموں کے اندر بند ہوں۔

۴۔ جو مسلمان مرتد ہو کر قریش کے پاس آ جائے گا اسے واپس نہیں کیا جائے گا، لیکن قریش کا جو آدمی اِسلام لانے کے بعد مسلمانوں کے پاس چلا جائے گا اسے واپس کر دیا جائے گا۔

مسلمان اس معاہدے کی شرطوں پر خوش نہ تھے لیکن آنحضرت ﷺ کے سمجھانے سے بات مان گئے۔[2] جب معاہدہ مکمل ہو گیا تو آنحضرت ﷺ نے مسلمانوں کو قربانی کے جانور ذبح کرنے اور سر منڈانے کا حکم دیا۔ پھر آپ ﷺ خود اُٹھے، قربانی کی اور سر منڈایا۔ آپ ﷺ کو دیکھ کر تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے قربانی کے جانور ذبح کیے اور سر منڈائے۔[3]

---

[1] صحيح مسلم :١٧٨٣ ، تاريخ الطبري :٢/٦٣٤

[2] صحيح مسلم:١٧٨٤ ، مسند أحمد :١٨٩٢٨، ابن إسحاق، السيرة النبوية، ص: ٤٦١

[3] صحيح البخاري:٢٧٣١_٢٧٣٢، مسند أحمد :١٨٩٢٨، ابن كثير، البداية والنهاية :٣٨٢/٤

صلح کی اہمیت

آنحضرت ﷺ عمرہ کے لیے تشریف لائے تھے مگر قریش مکہ نے روک دیا۔ آپ ﷺ بیت اللہ کی زیارت کیے بغیر واپس چلے گئے۔ اس زیارت کے بدلے میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو بڑی فتح عطا کی۔ اگرچہ بظاہر جنگ نہ ہوئی، نہ کسی فریق کو فتح ہوئی نہ شکست، بلکہ فریقین کے درمیان صلح کا معاہدہ ہوا لیکن یہ معاہدہ سیاسی اعتبار سے بڑی اہمیت رکھتا ہے۔

قریش مکہ نے رسولِ اکرم ﷺ سے معاہدہ کر کے اس بات کا اعتراف کر لیا کہ مسلمان ایک مستقل اور الگ قوم ہے، جو سیاسی اقتدار کی مالک ہے۔ اُنھوں نے اس بات کو بھی تسلیم کر لیا کہ ملک عرب میں مسلمانوں کی ایک حکومت ہے۔ اس لحاظ سے صلح حدیبیہ ایک شاندار فتح تھی۔

اس صلح کا یہ بھی فائدہ ہوا کہ ایک طرف تو حضرت رسولِ اکرم ﷺ قریش کی طرف سے مطمئن ہو کر یہودیوں کی سرکوبی کرنے کے قابل ہو گئے، دوسری طرف تبلیغِ اِسلام کی راہ میں قریش مکہ سب سے بڑی رکاوٹ بنے بیٹھے تھے، اس صلح نے یہ رکاوٹ بھی دور کر دی اور آنحضرت ﷺ اطمینان کے ساتھ ساری دنیا کو اِسلام کا پیغام پہنچانے لگے۔

مسلمانوں کے میل جول سے بعض اکابرِ قریش اور قائدینِ کفار اِسلام کی حقیقت سے آگاہ ہو کر اِسلام کی آغوش میں چلے آئے، مثلاً حضرت خالد بن ولید اور عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما[1]

قریش کے مظالم سے تنگ آ کر بعض مسلمانوں نے مکہ چھوڑنا چاہا لیکن معاہدہ حُدَیبِیَہ کی رُو سے مدینہ میں بھی انھیں پناہ نہ مل سکتی تھی تو وہ مجبور ہو کر قریش کے لیے خطرہ بن گئے۔

جیسا کہ حضرت ابوبصیر رضی اللہ عنہ کا قصہ مشہور ہے۔ آخر قریش نے تنگ آ کر از خود درخواست

[1] صحيح مسلم: ١٢١، ابن كثير، البداية والنهاية: ٤/٤٦٩

کی کہ معاہدے کی اس شق کو منسوخ کر دیا جائے۔[1] معاہدۂ حدیبیہ ابھی مکمل نہ ہونے پایا تھا کہ ایک نومسلم حضرت ابو جندل بن سُہَیل رضی اللہ عنہ قریش کے مظالم سے بھاگ کر پابزنجیر وہاں آپہنچا اور مسلمانوں کی پناہ لی۔ اس کے باپ سُہیل بن عَمرو نے آنحضرت ﷺ سے مطالبہ کیا کہ آپ شرائط معاہدہ پوری کریں اور ابوجندل کو ہمارے سپرد کر دیں۔ چنانچہ آپ ﷺ نے حضرت ابو جندل رضی اللہ عنہ کو ان کے باپ سہیل کے سپرد کر دیا۔ مسلمانوں نے اس بات کو بہت ہی ذلت آمیز سمجھا۔ آپ ﷺ نے لوگوں کو سمجھا دیا اور حضرت ابوجندل رضی اللہ عنہ کو صبر و عزیمت کی تلقین کرتے ہوئے جلد خلاصی کی بشارت سنائی۔[2]

خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کا اِسلام لانا

صلح حدیبیہ کے بعد مشرکینِ مکہ کے بعض بڑے بڑے لوگوں کو مسلمانوں سے میل جول کا موقع ملا اور وہ مسلمانوں کے بلند اخلاق اور پاکیزہ زندگی سے بے حد متاثر ہوئے۔ ایک دن حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے قریش کے اجتماع میں کھڑے ہو کر یہ تقریر کی:

”ہر عقلمند انسان کو یہ معلوم ہو چکا ہے کہ حضرت محمد ﷺ نہ تو شاعر ہیں نہ جادوگر، آپ ﷺ کا کلام خدا کا کلام ہے۔ ہر ہوش منداور سمجھدار آدمی کا فرض ہے کہ آپ ﷺ کی پیروی کرے۔“

ابوجہل کا بیٹا عِکرِمہ یہ تقریر سن کر حیران و ششدر رہ گیا۔ اس کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی اور بولا: اے خالد! تیری عقل و دانش کو کیا ہوا؟ خالد رضی اللہ عنہ نے جواب دیا:

”کچھ نہیں ہوا، البتہ میں نے اِسلام قبول کرلیا ہے۔“

عِکرِمہ نے حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو اپنے ارادے سے باز رکھنے کی ہر چند کوشش کی اور خالد رضی اللہ عنہ کے آباء و اجداد کا واسطہ دے کر جوش دلایا۔ خاندانی عَصَبِیّت اور قریش کی عزت کا نام لے کر خالد کے جذبات سے کھیلنا چاہا لیکن حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے صرف ایک ہی جواب دیا

---

[1] صحيح البخاري: ۲۷۳۱۔۲۷۳۲

[2] صحيح البخاري: ۲۷۳۱۔۲۷۳۲

کہ یہ باتیں زمانہ جاہلیت کی ہیں، اب رُشد و ہدایت اور حق وصداقت واضح ہو چکا ہے، جاہلیت کی عصبیت ختم ہو چکی ہے اور میں مسلمان ہو چکا ہوں۔[1]

حضرت خالد رضی اللہ عنہ مدینے جانے کے لیے گھر سے نکلے۔ راستے میں حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے ملاقات ہوگئی۔ عمرو نے پوچھا: ابوسلیمان! (خالد رضی اللہ عنہ کی کنیت تھی) کہاں کا ارادہ ہے؟ حضرت خالد رضی اللہ عنہ بولے: ''حق وصداقت کی راہ واضح ہو چکی ہے۔ حضرت محمد ﷺ خدا کے برحق نبی ہیں۔ میں مسلمان ہونے جا رہا ہوں۔ بھلا کب تک رکا رہ سکتا تھا۔''

حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کہنے لگے: ''میں بھی اسلام قبول کرنے کے ارادہ سے نکلا ہوں۔'' دونوں ساتھی حضرت رسولِ اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ آگے بڑھ کر آپ ﷺ کے ہاتھ پر بیعت کر کے مسلمان ہو گئے۔[2] پھر حضرت عمرو رضی اللہ عنہ آگے بڑھے اور عرض کیا: یارسول اللہ! میں اس شرط پر آپ کی بیعت کرتا ہوں کہ آپ میرے گزشتہ گناہوں اور بداعمالیوں پر خطِ تنسیخ کھینچ دیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

> ''اے عمرو! اسلام لے آنے کے بعد تمام گناہ معاف ہو جاتے ہیں اور ہجرت تمام گزشتہ بدکرداریوں اور جرموں کو حرف غلط کی طرح مٹا دیتی ہے۔''[3]

---

[1] الجنرال، أ، أكرم، سيف الله خالد بن الوليد، ص: ١٠٠، الصلابي، السيرة النبوية: ٣٦٤/٢

[2] ابن كثير، البداية والنهاية: ٤٧٢/٤، البيهقي، دلائل النبوة: ٣٤٩/٤

[3] صحيح مسلم: ١٢١، مسند أحمد: ١٧٧٧٧

ہم عصر حکمرانوں کو تبلیغِ اِسلام

اِسلام ایک عالمگیر نظامِ حیات ہے۔ حضرت رسولِ مقبول ﷺ نے اِسلامی دعوت وتبلیغ کو تدریجاً ہر گروہ تک پہنچانے کی کوشش فرمائی۔ پہلے اِسلام کا پیغام گھر کے لوگوں کو سنایا۔ گھر کی چار دیواری سے نکل کر قریبی رشتہ داروں تک خدا کا پیغام پہنچایا۔ اس کے بعد اہلِ مکہ کو، پھر مکے کے آس پاس کی بستیوں کو، پھر ان مختلف قبائل کو جو حج کے لیے مکے آتے تھے، دعوت اِسلام دی۔ آہستہ آہستہ آپ ﷺ کی آواز مدینے تک پہنچی۔ جب حالات سازگار ہوئے اور صلح حدیبیہ کے بعد آپ ﷺ کو یہودیوں اور مشرکین مکہ کے جھمیلوں سے ذرا فرصت ملی تو آپ ﷺ نے سلاطین اور حکمرانوں کو دنیا کے مختلف حصوں میں خطوط کے ذریعے اِسلام کی دعوت دی۔[1]

اس زمانے میں ملک عرب کے آس پاس بڑے بڑے حکمرانوں میں قیصرِ روم، شاہِ ایران، سلطانِ مصر، نجاشی حبشہ وغیرہ زیادہ مشہور تھے۔[2] آپ ﷺ نے ان حکمرانوں کے نام تبلیغی خطوط بھیجے۔ ان خطوط پر مہر لگانے کے لیے آپ ﷺ نے چاندی کی ایک مہر بنوائی جس میں "مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ" اس ترتیب سے کُھدا ہوا تھا:

اَللّٰہ

رَسُوْلُ

مُحَمَّدٌ[3]

---

[1] ابن سعد، الطبقات الكبرى: ۲۵۸/۱۔۲۹۰

[2] صحیح مسلم: ۱۷۷٤، ابن سید الناس، عیون الأثر: ۲۵۹/۲

[3] صحیح البخاري: ٦٥، مصنف ابن أبي شيبة: ٥١٥١، أبو الشيخ الأصبهاني، أخلاق النبي ﷺ وآدابه، ص: ۹۸، ح: ۳۵۸، ابن سعد، الطبقات الكبرى: ۲۵۸/۱۔۲۹۰

ہرقل کے نام خط

ہرقل قیصرِ روم کے نام آپ ﷺ نے یہ خط لکھا:

" بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ:

''اللہ کے رسول محمد بن عبد اللہ کی طرف سے ہرقل قیصرِ روم کے نام! جو سیدھے راستے پر چلا اس کے لیے سلامتی ہے۔ اِسلام لے آؤ سلامتی میں رہو گے۔ اللہ تمھیں دُگنا اجر دے گا۔ اگر تم نے روگردانی کی تو تمھاری رعایا کا گناہ بھی تمھاری گردن پر ہوگا۔ اے اہلِ کتاب! آؤ ہم آپس میں مشترک بات پر جمع ہو جائیں۔ اللہ کے سوا ہم کسی اور کی عبادت نہ کریں اور نہ کسی کو اس کا شریک و ساجھی ٹھہرائیں۔ اللہ کو چھوڑ کر آپس میں ایک دوسرے کو رب اور مالک نہ بنالیں۔ اگر تم انکار کردو تو گواہ رہو کہ ہم فرماں بردار اور مسلمان ہیں۔''[1]

قیصرِ روم ملک شام میں آیا ہوا تھا۔ حضرت دِحیہ کلبی رضی اللہ عنہ اس کے پاس خط لے کر گئے۔ ہرقل خط سن کر مسلمانوں کے سفیر سے عزت و توقیر سے پیش آیا اور حکم دیا کہ اگر کوئی عرب میرے ملک میں موجود ہو تو اسے بلایا جائے۔ اتفاق سے سردار قریش ابوسفیان وہاں موجود تھا، اسے ہمراہیوں سمیت دربار میں حاضر کیا گیا۔

ہرقل نے پوچھا کہ آپ ﷺ کا قریبی رشتہ دار کون ہے؟ ابوسفیان کے ساتھی بولے: ابوسفیان۔ چنانچہ ہرقل نے ابوسفیان کو سامنے بٹھایا اور اس کے ساتھیوں کو اس کے پیچھے۔ پھر حکم دیا کہ میں اس شخص سے کچھ پوچھوں گا، اگر یہ جھوٹ بولے تو تم فوراً ٹوک دو۔

ہرقل نے کہا کہ جس شخص نے تمھارے ملک میں نبوت کا دعویٰ کیا ہے مجھے اس کے

[1] صحيح البخاري: ۷۔۴۵۵۳، صحيح مسلم: ۱۷۷۳

حالات بتاؤ۔ پہلے تو ابوسفیان نے ہرقل کو یہ کہہ کر ٹالنا چاہا کہ اس شخص کے حالات سے دولت پناہ کو کیا سروکار، لیکن جب ہرقل نے اصرار کیا اور کہا کہ میرے سوال کا جواب دو تو پھر ابوسفیان نے کہا: اے بادشاہ سلامت! آپ جو کچھ دریافت فرمانا چاہتے ہیں پوچھیں:

ہرقل: اس کا حسب نسب بتاؤ۔

ابوسفیان: اس کا نسب تو خالص ہے۔

ہرقل: کیا اس کے خاندان میں کبھی کسی نے ایسا دعویٰ کیا؟

ابوسفیان: نہیں۔

ہرقل: کیا اس کے خاندان میں کوئی ایسا بادشاہ گزرا ہے جس کا تاج وتخت تم نے چھین لیا ہو اور یہ شخص اس سلطنت کو واپس لینا چاہتا ہو؟

ابوسفیان: نہیں۔

ہرقل: اس کے ماننے والے کون لوگ ہیں؟

ابوسفیان: کمزور و مسکین لوگ ، نوجوان لڑکے اور عورتیں اس کے پیرو ہیں۔ قوم کے معززین اور بزرگوں نے اس کو نہیں مانا۔

ہرقل: کیا لوگ اس پیغمبر کو مان کر محبت کی وجہ سے اس سے وابستہ رہتے ہیں یا نفرت کے سبب اسے چھوڑ جاتے ہیں؟

ابوسفیان: اس پر ایمان لانے کے بعد کبھی کسی شخص نے اسے چھوڑا نہیں۔

ہرقل: کیا وہ وعدہ خلافی اور بے وفائی بھی کرتا ہے؟

ابوسفیان: نہیں! ہمارے اور اس کے درمیان صلح ہے اور ہمیں عہد شکنی اور غداری کا کوئی خدشہ نہیں۔

اس کے بعد ہرقل نے کہا کہ اگر تم نے سچ بولا ہے تو یہ سب پیغمبرانہ اوصاف ہیں۔ ہر زمانے میں پیغمبر ایسے ہی گزرے ہیں۔ پھر کہنے لگا کہ وہ دن دُور نہیں جب میری سلطنت بھی

اس پیغمبر کے زیر نگیں ہوگی۔

ہرقل نے یہ خواہش بھی ظاہر کی کہ میں آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوکر قدم بوسی کا شرف حاصل کروں۔[1]

حاکم مصر کے نام خط

آپ ﷺ نے حاکم مصر مُقوقس کے نام یہ خط تحریر فرمایا:

"بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

"اللہ کے بندے اور اس کے رسول محمد کی طرف سے قبطیوں کے سردار مقوقس کے نام!

جس نے ہدایت اختیار کی اس پر سلامتی ہو۔

اما بعد: میں تمھیں اسلام کی دعوت دیتا ہوں۔ اسلام قبول کر لو امن و سلامتی میں رہو گے۔ اللہ تمھیں دو چند اجر دے گا۔ اگر تم رُوگردانی کرو گے تو ہر قبطی کا گناہ تمھاری گردن پر ہے اے کتاب والو! آؤ ہم آپس میں مشترک بات پر اتفاق کر لیں۔ وہ یہ کہ ہم سب ایک اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں، کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہرائیں۔ خدا کو چھوڑ کر ایک دوسرے کو رَبّ نہ بنا لیں۔ اگر تم رُوگردانی کرو تو کہو کہ گواہ رہو کہ ہم فرماں بردار (مسلمان) ہیں۔"[2]

مُقَوقِس قیصرِ روم کا صوبائی حاکم تھا۔ ہرقل کی طرح مقوقس مصر نے بھی آپ ﷺ کے خط کی بڑی عزت و تعظیم کی اور آپ ﷺ کے سفیر حضرت حاطب بن ابی بلتعہ رضی اللہ عنہ

[1] صحيح البخاري :٧-٤٥٥٣ ، صحيح مسلم :١٧٧٣، ابن كثير، البداية والنهاية :٤/٥٠٥

[2] ابن سيد الناس، عيون الأثر :٢/٢٦٥، القلقشندي، صبح الأعشى :٦/٣٦٤

کے ہاتھ بہت تحفے تحائف بھیجے جن میں ماریہ قبطیہ بھی تھیں جو بعد میں اُم المومنین حضرت ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہا کہلائیں۔[1]

نجاشی شاہِ حبشہ کے نام خط

حضرت رسولِ مقبول ﷺ نے ایک خط میں شاہِ حبشہ کو دعوتِ اِسلام دیتے ہوئے تحریر فرمایا:

"بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمَانِ الرَّحِیْمِ

''اللہ کے رسول محمد کی طرف سے نجاشی شاہِ حبشہ کے نام!

تم پر سلامتی ہو۔ میں تمھارے سامنے اس اللہ کی تعریف کرتا ہوں جو حقیقی بادشاہ ہے، پاک ہے، امن وسلامتی کا سرچشمہ ہے، امن دینے والا اور عدل کرنے والا ہے۔ میں اس بات کی گواہی دیتا ہوں کہ عیسیٰ بن مریم علیہ السلام روح اللہ اور کلمۃ اللہ ہیں جو اللہ تعالیٰ نے مریم بتول کو عطا کیا جو پاکباز اور عفیفہ تھیں۔ اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کو اسی طرح اپنی قدرت کاملہ سے پیدا کیا جس طرح اس نے حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا کیا تھا۔ میں تمھیں اس خدائے واحد کی طرف بلاتا ہوں جس کا کوئی شریک نہیں اور اس شرط پر تعاون کا ہاتھ بڑھاتا ہوں کہ تم خدائے واحد کی اطاعت اور میری تابعداری کرو اور یہ کہ تم اس پیغام پر ایمان لاؤ جو میں لے کر آیا ہوں۔ میں اللہ کا رسول ہوں۔ میں تمھیں اور تمھارے لاؤلشکر کو اللہ کی طرف بلاتا ہوں۔ میں اپنا فریضۂ تبلیغ ادا کر چکا ہوں۔ تمھیں حق بات سنا دی ہے۔ تم میری نصیحت مان لو۔ جو

[1] البیهقي، دلائل النبوة: ۳۹۵/۴، ابن سعد، الطبقات الكبرى: ۲۶۰/۱

راہِ راست پر چلا امن وسلامتی میں رہا۔''[1]

نجاشی نے آپ ﷺ کے خط کو سر آنکھوں پر لگایا۔ بعض روایات میں مذکور ہے کہ وہ مسلمان ہو گیا تھا اور اس کی موت کے بعد آنحضرت ﷺ نے اس کی نماز جنازہ غائبانہ ادا کی تھی۔ مسلمان نجاشی کی بڑی عزت کرتے ہیں۔[2]

کسریٰ پرویز کے نام خط

آپ ﷺ نے ایک خط شاہِ ایران کسریٰ پرویز کے نام لکھا اور اس کو دعوتِ اسلام دی۔ آپ ﷺ نے تحریر فرمایا:

''اللہ کے رسول محمد ﷺ کی طرف سے کسریٰ شاہِ ایران کے نام!

جس نے راہِ ہدایت اختیار کی اور اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لایا وہ امن وسلامتی میں رہا۔ میں تمھیں اللہ کی طرف بلاتا ہوں۔ میں تمام کائنات کی طرف رسول بن کر آیا ہوں تاکہ ہر زندہ شخص کو اعمالِ بد کے نتائج وعواقب سے آگاہ کروں اور برے کاموں کی سزا سے ڈراؤں، تاکہ کافروں پر اتمامِ حجت ہو جائے۔ تم اسلام میں داخل ہو جاؤ امن وسلامتی میں رہو گے۔ اگر تم نے پیغامِ حق سے رُوگردانی کی تو تمام مجوسیوں کا وبال تمھارے کندھوں پر ہوگا۔''[3]

کسریٰ پرویز کو حکومت وسلطنت پر بڑا ناز تھا۔ ایک سلطانِ جابر کی حیثیت میں اس نے آپ ﷺ کے نامہ مبارک کو اپنی توہین سمجھ کر چاک کر دیا اور اپنے صوبائی حاکمِ یمن کو لکھا کہ وہ آپ ﷺ کو اپنے آدمیوں کے ساتھ ایران بھیجے۔

جب حضرت رسولِ مقبول ﷺ کو معلوم ہوا کہ شاہ ایران نے برافروختہ ہو کر

---

[1] ابن سید الناس، عیون الأثر: ۲/۲٦٤، القلقشندي، صبح الأعشی: ٦/٣٦٤

[2] صحیح البخاري: ١٢٤٥، صحیح مسلم: ٩٥١، ابن کثیر، البدایة والنهایة: ٣/٢٩٦

[3] تاریخ الطبري: ٢/٦٥٤، ابن کثیر، البدایة والنهایة: ٤/٥١٢

آپ ﷺ کے نامہ مبارک کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''اللہ تعالیٰ اسی طرح اس کی سلطنت کو پارہ پارہ کر دے گا۔'' چنانچہ تاریخ شاہد ہے کہ آپ ﷺ کی وفات کے چند سال بعد مسلمانوں نے ایران پر حملہ کر کے اس کی سلطنت کو زیرِ نگیں کر لیا۔[1]

اس کے علاوہ آپ ﷺ نے بحرین، بصریٰ اور یمامہ کے حکمرانوں کو بھی خطوط لکھے۔[2]

---

[1] صحيح البخاري:٦٤ ، ابن سيد الناس ، عيون الأثر :٢/٢٦٣، ابن كثير، البداية والنهاية: ٥١١/٤ـ٥١٦

[2] ابن سيد الناس، عيون الأثر :٢/٢٦٦ ، ابن سعد، الطبقات الكبرى :١/٢٥٨ـ٢٩٠، ابن كثير، البداية والنهاية :٤/٦٧١

غزوۂ خیبر

خیبر ایک بستی تھی جس میں یہودی رہتے تھے۔ان یہودیوں نے غزوۂ خندق میں قریش کے ساتھ مل کر مسلمانوں پر چڑھائی کی تھی۔

حضرت رسولِ اکرم ﷺ خوب جانتے تھے کہ یہودی نہایت متعصب اور دولت مند قوم ہے اور مسلمانوں کی سخت دشمن۔ یہ لوگ اپنے مذہب کے بھی بڑے پکے تھے۔قریش کے بہت سے آدمی بتوں کی پوجا چھوڑ کر مسلمان ہو گئے تھے،لیکن یہودی اِسلام کے پیغام کو سن کر بھی ایمان نہ لائے بلکہ آنحضرت اور مسلمانوں کی مخالفت پر تُل گئے۔ وہ اپنے آپ کو مضبوط کرنے اور مسلمانوں کو ڈرانے کے لیے اِردگرد کے قبیلوں سے ساز باز کرنے لگے،تاکہ مسلمانوں کے مقابلے میں آئندہ جنگ کے موقع پر وہ قبیلے یہودیوں کی امداد کر سکیں۔ یہودیوں نے ہر موقع پر مسلمانوں کے دشمنوں کا ساتھ دیا اور ہمیشہ اِسلام کے خلاف سازشیں کرتے رہے۔

جب رسولِ اکرم ﷺ صلح حدیبیہ کے بعد مدینے میں تشریف لائے تو آپ ﷺ نے سب سے پہلے یہودیوں کو سزا دینے کا فیصلہ کیا۔ اتنے لمبے سفر کے بعد بمشکل بیس دن آرام کیا ہوگا کہ آنحضرت ﷺ نے صلح حدیبیہ والے ساتھیوں کو لے کر خیبر کا رُخ کیا۔[1]

مسلمان فوج کے ساتھ کچھ عورتیں بھی تھیں تاکہ سپاہیوں کو پانی پلائیں اور زخمیوں کی مرہم پٹی کریں۔[2] یہ پہلا موقع تھا کہ مسلمان فوج نے جھنڈے لہرائے تھے۔

---

[1] البيهقي، دلائل النبوة :٤/١٩٤

[2] صحيح البخاري:٢٨٨٢ ـ ٢٨٨٣ ، ابن هشام ، السيرة النبوية :٢/٣٣٤

اِسلامی فوج یہ ترانہ گاتی جارہی تھی:

''اے اللہ! اگر تو نہ ہوتا تو ہمیں یہ ہدایت نہ ملتی۔ ہماری جانیں قربان۔ ہماری خطائیں معاف کردے۔ ہمیں تسکینِ قلب عطا فرما اور ثابت قدم رکھ۔ ظالموں نے ہماری طرف ہاتھ بڑھائے ہیں اور فتنہ پیدا کیا ہے۔ ہم ان سے ڈرنے والے نہیں۔ اے اللہ! ہم تیری مہربانی کے محتاج ہیں۔''[1]

جب مسلمانوں کا لشکر خیبر کی طرف روانہ ہوا تو یہودیوں کو بھی خبر پہنچ گئی۔ اُنھوں نے اپنے قلعوں کو مضبوط کرلیا۔ بال بچوں اور مال واسباب کو محفوظ جگہوں میں چھپا دیا اور خود قلعوں میں پناہ گزین ہوگئے۔[2]

مسلمانوں نے خیبر پہنچ کر یہودیوں کا محاصرہ کرلیا۔ چھ سات دن کے بعد مسلمانوں نے ایک ایک کرکے یہودیوں کے سب قلعے فتح کرلیے۔[3] اس جنگ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بڑی بہادری دکھائی۔[4]

خیبر فتح کرلینے کے بعد حضرت رسولِ اکرم ﷺ نے یہودیوں کو جلاوطن کرکے ان کے کھیت اور باغ ضبط کرنے کا حکم دیا اور یہودیوں کو اجازت دے دی کہ وہ جتنا مال واسباب لاد کرلے جاسکیں لے جائیں۔[5]

لیکن جب جلاوطنی کا وقت آیا تو یہودیوں نے عرض کیا کہ مسلمانوں کو باغوں اور کھیتوں میں کام کرنے کے لیے مزدوروں کی ضرورت ہوگی، اگر ہمیں جلاوطن نہ کیا جائے تو ہم یہ خدمت بجا لانے کو تیار ہیں۔ مسلمانوں کے پاس اس وقت کھیتی باڑی کے لیے

---

[1] صحيح البخاري:٤١٩٦، ابن كثير، البداية والنهاية :٣٩٧/٤

[2] صحيح البخاري:٤١٩٧، ٤١٩٨، ابن سيد الناس، عيون الأثر :١٣٢/٢

[3] ابن كثير، البداية والنهاية :٤٠٩/٤، ٤١٨، ابن هشام، السيرة النبوية :٣٣٠/٢، الواقدي، المغازي :٦٦٦/٢

[4] صحيح البخاري :٢٩٧٥، ٤٢١٠، صحيح مسلم:٢٤٠٧، ابن كثير،البداية والنهاية :٤٠١/٤

[5] البيهقي، دلائل النبوة :٢٢٩/٤

آدمی نہ تھے، اس لیے آنحضرت ﷺ نے یہودیوں کی یہ درخواست منظور فرماتے ہوئے حکم دیا کہ ہم جب تک چاہیں گے تمھیں رکھیں گے اور جب چاہیں گے نکال دیں گے۔ یہودیوں نے اس شرط کو منظور کر لیا اور آدھی بٹائی پر کھیتی باڑی کرنے لگے۔ یہ واقعہ ۷ ھ کا ہے۔[1]

ایک طرف تو خیبر کی فتح نے مسلمانوں کی دھاک بٹھا دی اور دوسری طرف یہودیوں کے اقتدار اور سازشوں کا خاتمہ کر دیا۔ خیبر کے یہودیوں کی شکست دیکھ کر دوسرے علاقوں کے یہودی بھی مسلمانوں کی اطاعت قبول کر کے جزیہ ادا کرنے لگے۔ اس طرح یہودیوں جیسی چالاک، مسلح، طاقتور اور دولت مند قوم کی طرف سے خطرہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا۔

جنگِ مُوتہ

جزیرۂ عرب اور شام کی سرحد پر غسّان کا عربی قبیلہ آباد تھا۔ یہ لوگ عرصے سے عیسائیت قبول کر چکے تھے اور قیصر روم کے باجگزار ہو کر اس کی حمایت میں رہتے تھے۔ حضرت رسولِ اکرم ﷺ نے غسانی حاکم کے نام بھی ایک تبلیغی خط تحریر فرمایا تھا لیکن اس نے آپ ﷺ کے نامہ بَر کو مار ڈالا۔ اس کا بدلہ لینے کے لیے آنحضرت ﷺ نے حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کی سرکردگی میں تین ہزار کا ایک لشکر روانہ فرمایا۔[2]

قیصرِ روم کی فوج سے مسلمانوں کی مُڈبھیڑ ہو گئی۔ مُوتہ کے مقام پر بڑا معرکہ ہوا۔ رومیوں کی تعداد بہت زیادہ تھی،[3] پھر بھی مسلمان سپاہی بڑی بہادری سے لڑے۔ پہلے سپہ سالار حضرت زید رضی اللہ عنہ میدانِ جنگ میں دادِ شجاعت دیتے ہوئے شہید ہو گئے۔ ان کی

---

[1] صحيح البخاري:۲۲۸۵ ، ۲۳۲۸۔۲۳۳۱ ، صحيح مسلم:۱۵۵۱، سنن أبي داود :۳۰۰۶۔ ۳۰۰۷، البيهقي ، دلائل النبوة :۲۳۰/٤ ، ابن كثير، البداية والنهاية :٤/٤۲۰

[2] ابن كثير، البداية والنهاية :٤/٤۷٥

[3] ابن هشام ، السيرة النبوية :۲/۳۷٥ ، ابن كثير، البداية والنهاية :٤/٤۷۷ ، الواقدي، المغازي :۲/۷٦۰

شہادت کے بعد حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ سپہ سالار ہوئے۔ وہ بھی بہادری کے جوہر دکھا کر جامِ شہادت نوش فرما گئے۔ اس وقت ان کی عمر ۵۵ برس کی تھی۔ پھر حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے کمان سنبھالی۔ وہ بھی بڑی بے جگری سے لڑتے ہوئے شہید ہوگئے۔ ان کے بعد حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ سپہ سالار بنے۔[1]

حضرت خالد رضی اللہ عنہ بڑی بہادری سے لڑے اور اس بے دریغی اور زور سے تلوار چلائی کہ یکے بعد دیگرے اپنی نو تلواریں دشمنوں پر مار مار کر توڑ دیں۔[2] بالآخر اپنی فوج کو اس حکمتِ عملی سے لڑایا کہ دشمنوں نے یہ سمجھا کہ مسلمانوں کو کمک پہنچ گئی ہے۔ اس بنا پر دشمن مرعوب ہو کر پیچھے ہٹنا شروع ہوگیا۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے دشمن کی اس پسپائی کو غنیمت سمجھا۔ ایک طرف تو وہ مسلمانوں کی فوج کو دشمن کے نرغے سے نکال کر بخیریت واپس لے آئے اور دوسری طرف عسکری تدبر سے دشمنوں کو پسپائی پر مجبور کر دیا۔ اس طرح میدان مسلمانوں کے ہاتھ رہا۔[3] اس موقع پر حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو بارگاہِ نبوی ﷺ سے ''سیف اللہ'' یعنی اللہ کی تلوار کا لقب عطا ہوا تھا۔[4] یہ واقعہ سن ۸ ہجری کا ہے۔

---

[1] صحيح البخاري: ٤٢٦٢ ، ابن هشام ، السيرة النبوية: ٣٨٠/٢

[2] صحيح البخاري: ٤٢٦٥ـ٤٢٦٦

[3] ابن كثير، البداية والنهاية: ٤٨٣/٤ ، الواقدي، المغازي: ٧٦٤/٢

[4] صحيح البخاري: ٤٢٦٢ ، ابن عبد البر، الاستيعاب: ١٣/٢

پانچواں باب

فتح مکہ سے وفات تک

صلح نامہ حُدیبیہ کی ایک شرط یہ بھی تھی کہ دس سال تک لڑائی نہ ہوگی اور حلیف واتحادی قبیلے بھی اس شرط کی پابندی کریں گے، مگر خدا کی قدرت دیکھیے کہ خود مکہ والوں نے سن ۸ ہجری میں فتح مکہ کا موقع پیدا کر دیا۔

اسبابِ فتح مکہ

فتح مکہ کا سبب یہ ہوا کہ قریش کے اتحادی قبیلہ بنوبکر نے مسلمانوں کے حلیف قبیلہ بنوخزاعہ پر حملہ کر دیا۔ خود قریش کے بہت سے بہادروں نے بھیس بدل کر رات کے اندھیرے میں بنوخزاعہ پر تلواریں چلائیں۔ بنوخزاعہ نے تنگ آ کر خانہ کعبہ میں پناہ لی مگر وہاں بھی پناہ نہ مل سکی۔ قریش نے معاہدہ کی خلاف ورزی کر کے صلح کو توڑ دیا۔ اب معاہدے کی شرط کے مطابق مسلمانوں پر بنوخزاعہ کی مدد فرض تھی۔[1]

بنوخزاعہ کا ایک سردار بُدَیل نامی فریاد لے کر حضرت رسولِ اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔[2] قریش کی بدعہدی کے حالات سن کر آپ ﷺ کو بہت رنج ہوا۔ اس لیے آپ ﷺ نے ایک طرف تو بنوخزاعہ سے امداد کا وعدہ فرمایا اور دوسری طرف قریش مکہ کے پاس قاصد بھیج کر مندرجہ ذیل تین شرائط پیش کرتے ہوئے قریش کو اختیار دیا کہ وہ کوئی ایک شرط منظور کر لیں:

۱۔ بنوخزاعہ کے جو لوگ قتل ہو گئے ہیں ان کا خون بہا ادا کریں۔

۲۔ بنوبکر کا ساتھ چھوڑ دیں اور ان کی کسی قسم کی حمایت نہ کریں۔

۳۔ صلح حدیبیہ کے معاہدے کو توڑ دینے کا اعلان کریں۔

---

[1] ابن کثیر، البداية والنهاية: ٤/٥٢٤، ابن هشام، السيرة النبوية: ٣/٣٩٠

[2] ابن هشام، السيرة النبوية: ٢/٣٩٥

قریش کے سردار نے تیسری شرط منظور کر لی۔[1]

یعنی اب حدیبیہ کا معاہدہ باقی نہیں رہا۔ جب قاصد مدینے کو روانہ ہو چکا تو قریش بہت پچھتائے۔ اُنھوں نے اپنے سردار ابوسفیان کو اپنا نمائندہ بنا کر مدینہ بھیجا تا کہ صلح حدیبیہ کو ازسرِنو بحال کیا جائے۔ ابوسفیان مدینے پہنچا، پہلے حضرت رسولِ اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کی۔ وہاں سے کوئی جواب نہ ملا تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے آ کر کہا، اُنھوں نے انکار کیا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچا۔ وہاں سے انکار ہوا تو وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خدمت میں پہنچا۔ اُنھوں نے فرمایا کہ آنحضرت ﷺ جو فیصلہ کر چکے ہیں وہ آخری ہے۔ کسی کی مجال نہیں کہ وہ آپ ﷺ کو اس بارے میں کوئی مشورہ دے۔ اب بہتر یہ ہے کہ تم مسجد میں جا کر اعلان کر دو کہ میں صلح حدیبیہ کو بحال کرتا ہوں۔ چنانچہ اس نے ایسا ہی کیا۔[2]

ابوسفیان نے واپس جا کر قریش سے یہ واقعہ بیان کیا، وہ سن کر حیران ہوئے کہ بات کیا بنی، نہ یہ صلح ہے نہ جنگ۔[3] قریش عجب مشکل میں تھے، نہ تو وہ اطمینان سے بیٹھ سکتے تھے، نہ جنگ کی تیاری کر سکتے تھے۔

حضرت رسولِ اکرم ﷺ نے فوراً تیاری شروع کر دی اور احتیاط کی کہ قریش مکہ کو خبر تک نہ ہو۔ آپ ﷺ دس ہزار کا لشکر لے کر نکل پڑے۔ اپنا مقصد فوج پر بھی ظاہر نہ کیا، بلکہ دکھاوے کے لیے چکر کاٹ کر اور نامعلوم راستوں سے گزرتے ہوئے مکہ مکرمہ پہنچے۔ قریش اب تک بالکل بے خبر تھے۔ جب رات کے وقت پڑاؤ کے چولہے روشن ہوئے تو پھر قریش کو علم ہوا کہ مسلمان تو مکہ میں آ پہنچے ہیں۔[4]

حضرت عباس رضی اللہ عنہ اپنے اہل و عیال سمیت ہجرت کر کے مدینہ کو جا رہے تھے کہ راستے میں حضرت رسولِ اکرم ﷺ سے ملے اور فوج میں شامل ہو گئے۔ ان کی بڑی خواہش تھی کہ

---

[1] الواقدي، المغازي: ۷۸۶/۲، الصالحي، سبل الهدى: ۲۰۴/۵

[2] ابن الأثير، الكامل: ۲۴۱/۲

[3] تاريخ الطبري: ۴۷/۲

[4] ابن الجوزي، الوفا بأحوال المصطفى: ۲۴۲/۲، ابن سيد الناس، عيون الأثر: ۱۶۷/۲

اہلِ مکہ کو امان مل جائے تاکہ مکے میں خونریزی نہ ہو۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ اسی ارادے سے باہر نکلے اور اِدھر اُدھر کسی مکہ جانے والے کی تلاش کرنے لگے، اتنے میں ابوسفیان مل گیا۔ وہ پڑاؤ کی آگ دیکھ کر حیران تھا کہ اتنا بڑا لشکر کہاں سے آ گیا۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے بتایا کہ یہ حضرت رسولِ اکرم ﷺ ہیں اور ان کا لشکر پڑاؤ ڈالے پڑا ہے۔ یہ سن کر ابوسفیان کے اَوسان خطا ہو گئے۔ وہ ہمت ہار بیٹھا اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے ساتھ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر اِسلام قبول کر لیا۔[1]

ابوسفیان کو تھوڑی دیر کے لیے روک لیا گیا تاکہ اسلامی لشکر مکے میں داخل ہونے کے لیے چل پڑے۔ لشکر کا ایک ایک دستہ ابوسفیان کے سامنے گزرتا چلا گیا۔ یہ دیکھ کر اس کے ہوش و حواس گم ہو گئے۔ اس کے دل میں اِسلامی فوج کا رُعب بیٹھ گیا اور اسے یقین ہو گیا کہ مسلمانوں کا مقابلہ کرنا ممکن نہیں۔ اب اسے اجازت مل گئی کہ وہ شہر میں واپس جائے[2] اور اعلان کر دے کہ حضرت رسولِ اکرم ﷺ نے ہر اس شخص کو امن و امان دینے کا وعدہ کیا ہے:

۱۔ جو ابوسفیان کے گھر میں داخل ہو جائے۔

۲۔ جو ہتھیار ڈال دے اور گھر کے اندر داخل ہو کر دروازے بند کر لے۔

۳۔ جو خانہ کعبہ میں داخل ہو جائے۔[3]

اِسلامی لشکر کا مکّے میں داخلہ

مکہ مکرمہ کے چاروں طرف اُونچے اُونچے دشوار گزار پہاڑ ہیں۔ شہر میں صرف ایک بڑا راستہ ہے جو شمال سے جنوب کو جاتا ہے۔ دو چھوٹے چھوٹے راستے ہیں جو اسی بڑے راستے میں آ کر مل جاتے ہیں۔ شمال میں بلندی اور اُونچائی ہے اور جنوب میں نشیب و پستی۔

---

[1] ابن كثير، البداية والنهاية: ٥٣٥/٤، ابن هشام، السيرة النبوية: ٤٠٠/٢

[2] صحيح البخاري: ٤٢٨٠، ابن هشام، السيرة النبوية: ٤٠٢/٢، ابن سيد الناس، عيون الأثر: ١٦٨/٢

[3] سنن أبي داود: ٣٠٢٢-٣٠٢٤، البيهقي، دلائل النبوة: ٣١/٥

حضرت رسولِ اکرم ﷺ نے فوج کو شہر میں داخل ہونے کا حکم دیا اور ایسی شاندار ہدایات دیں کہ جن سے آپ ﷺ کی جنگی مہارت اور لڑائی کے مختلف طریقوں سے واقفیت کا پتہ چلتا ہے۔ فوج کا بڑا حصہ حضرت رسولِ اکرم ﷺ کے ساتھ شمال کی طرف بڑھنے لگا۔[1] جنوب کی طرف سے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو ایک مضبوط دستہ دے کر بھیجا گیا۔[2] دونوں چھوٹے راستوں سے بھی دو دستے شہر میں داخل ہوئے۔[3]

حضرت رسولِ اکرم ﷺ نے فوج کو حکم دے رکھا تھا کہ جب تک کوئی مقابلہ نہ کرے کسی پر تلوار نہ اُٹھائی جائے۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے دستے کے سوا سب دستے کسی مقابلہ کے بغیر شہر میں داخل ہو گئے، صرف حضرت خالد رضی اللہ عنہ کی فوج کو تھوڑا سا مقابلہ کرنا پڑا۔ اس میں دو مسلمان شہید ہوئے اور بارہ کافر مارے گئے۔[4] کفار میدان چھوڑ کر بھاگ گئے۔ مسلمان خوشی کے شادیانے بجاتے اور خدا کا شکر بجالاتے، فاتحانہ انداز میں شہر میں داخل ہوئے۔ مکہ فتح ہو گیا۔[5] اِسلام کا بول بالا ہوا اور کفر ہمیشہ کے لیے دَب کر رہ گیا۔ جس شہر کے رہنے والوں نے حضرت رسولِ اکرم ﷺ کو گھر سے نکال دیا تھا آج وہی شہری آپ ﷺ کے رحم وکرم پر تھے۔

طوافِ کعبہ اور بُت شکنی

حضرت رسولِ اکرم ﷺ نے مکے میں داخل ہونے کے بعد خانہ کعبہ کا رُخ کیا۔ مہاجرین اور انصار آپ ﷺ کے ساتھ تھے۔ آپ ﷺ مسجد حرام میں داخل ہوئے۔ آپ ﷺ اونٹنی پر سوار تھے۔ حجرِ اَسود کی طرف بڑھے، اسے چھوا، پھر سواری پر ہی طواف شروع کر دیا۔[6]

---

[1] صحيح البخاري: ٤٢٨٩، ٤٢٩١ـ
[2] ابن كثير، البداية والنهاية: ٥٣٩/٤، تاريخ الطبري: ٥٦/٢
[3] ابن هشام، السيرة النبوية: ٤٠٦/٢، تاريخ الطبري: ٥٧/٢، ابن سيد الناس، عيون الأثر: ١٧٤/٢
[4] صحيح البخاري: ٤٢٨٠، ابن كثير، البداية والنهاية: ٥٣٩/٤ـ٥٤٨، تاريخ الطبري: ٥٨/٢
[5] ابن هشام، السيرة النبوية: ٤٠٧/٢
[6] ابن هشام، السيرة النبوية: ٤١١/٢، ابن إسحاق، السيرة النبوية، ص: ٥٣٤

خانہ کعبہ میں ۳۶۰ بت رکھے تھے۔ آپ ﷺ کے ہاتھ میں کمان تھی جس سے ایک ایک کو مار کر زمین پر گراتے اور فرماتے تھے:

﴿ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوقًا ﴾ [1]

''حق آ گیا اور جھوٹ نکل بھاگا، جھوٹ ہمیشہ شکست اُٹھانے والا ہے۔''

نصیحت اور معافی

طواف کے بعد آنحضرت ﷺ نے خانہ کعبہ کی دیواروں پر سے تمام تصویریں مٹا دیں، پھر نماز پڑھی [2] اور کعبے کے دروازے پر کھڑے ہو کر قریش کو مخاطب کر کے فرمایا:

''ایک خدا کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اس کا کوئی شریک نہیں۔ اس نے اپنا وعدہ پورا کر دیا۔ اپنے بندے کو فتح دی۔ زمانۂ جاہلیت کی جھگڑا کرنے والی باتیں مثلاً فخر، حق تلفی اور خون سب میرے پاؤں کے نیچے ہیں (یعنی آج سے سب ختم ہیں)۔ تمام انسان آدم کی اولاد ہیں اور آدم مٹی سے پیدا کیے گئے تھے۔'' [3]

پھر فرمایا: ''قریش! تمھارے خیال میں تم سے میں کیا سلوک کروں گا؟''

سب پکار اُٹھے: اچھا سلوک۔ آپ شریف بھائی ہیں اور شریفوں کی اولاد ہیں۔

یہ سن کر آپ ﷺ نے فرمایا: «لَا تَثْرِيبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ»

''آج تم پر کچھ بھی الزام نہیں، جاؤ تم سب آزاد ہو۔'' [4]

---

[1] صحيح البخاري: ٤٢٨٧، صحيح مسلم: ١٧٨١

[2] صحيح البخاري: ٤٢٨٨-٤٢٨٩، ٤٢٩٢، مسند أحمد: ١٥٢٦١

[3] سنن ابن ماجه: ٢٦٢٨، مسند أحمد: ٢٦٢٨، مسند أبي يعلى: ٤٢/١٠، السيوطي، جمع الجوامع: ١٥٨٦١، ابن سيد الناس، عيون الأثر: ١٧٨/٢

[4] ابن الأثير، الكامل: ٢٥٢/٢، أبو الشيخ الأصبهاني، أخلاق النبي ﷺ و آدابه، ص: ٣٨، ح: ٨٢، ابن سيد الناس، عيون الأثر: ٧٨/٢

نتائج

فتح مکہ نے اِسلام کی برتری کا اعلان کر دیا۔ فتح مکہ کے بعد اِسلام لانے والوں کی تعداد بڑی تیزی سے بڑھنے لگی۔ اس سے پہلے اِسلام لانے والوں کی راہ میں کئی رکاوٹیں تھیں۔ وہ لوگ کمزور تھے، قریش کا رُعب اور دباؤ اِسلام قبول کرنے میں سدِّ راہ تھا۔ کچھ قبیلے قریش کے رشتے دار تھے۔ وہ رشتہ داری کی وجہ سے مجبور تھے لیکن فتح مکہ کے بعد تمام رکاوٹیں دور ہوگئیں۔ اب لوگوں کو اِسلام لانے میں پوری آزادی تھی۔ کچھ لوگ اس لیے ایمان لائے کہ وہ سمجھتے تھے کہ سچا دین ماننے والے ہی مکہ فتح کر سکتے ہیں۔ فتح مکہ کے بعد تبلیغ اِسلام کی پوری آزادی ہوگئی۔

غزوۂ حُنَین

غزوۂ حنین سن ۸ ہجری میں ہوا۔[۱] اس کی وجہ یہ ہوئی کہ مکے سے کچھ فاصلے پر ثقیف اور ہوازن کے قبیلے آباد تھے۔ ان کا علاقہ بالخصوص طائف بڑا شاداب اور سرسبز تھا۔ ان لوگوں نے سوچا کہ مسلمانوں کو شکست دے کر قریش کی جاگیروں پر قبضہ کر لیا جائے اور مسلمانوں سے بت توڑنے کا انتقام بھی لیا جائے۔ چنانچہ فتح مکہ کے پندرہ دن بعد ہوازن اور ثقیف کے قبیلوں نے مل کر عرب کے لوگوں کو بھڑکایا اور جنگ کے لیے آمادہ کیا۔ جب آنحضرت ﷺ کو یہ معلوم ہوا تو آپ ﷺ نے ایک شخص عبداللہ بن ابی حَدرد اسلمی نامی کو خبر لانے کے لیے بھیجا۔ جب آپ ﷺ کو ان کی تیاری کا یقین ہو گیا تو آپ ﷺ نے فیصلہ کیا کہ مکے سے باہر جنگ کی جائے۔[۲]

اِدھر حضرت رسولِ اکرم ﷺ نے جنگ کی تیاری شروع کی۔ آپ ﷺ نے مکے کے ایک سردار صفوان بن اُمَیّہ کو بلایا اور اس سے ایک سو زرہیں اور اتنے ہی ہتھیار اُدھار مانگ لیے اور بارہ ہزار کا لشکر لے کر چل پڑے۔[۳]

اُدھر دشمن چار ہزار[۴] آدمی لے کر مکے کی طرف بڑھتے ہوئے وادیِ حُنین میں آ اترے۔ دشمنوں نے اپنے سردار مالک بن عوف کے مشورے سے اپنے مویشیوں اور اہل و عیال کو بھی ساتھ لے لیا تھا تاکہ کوئی شخص بیوی بچوں کو چھوڑ کر میدانِ جنگ سے بھاگ نہ سکے۔ اب دشمن کے تیر انداز مسلمانوں کی تاک میں چھپ کر بیٹھ رہے۔[۵]

---

[۱] ابن كثير، البداية والنهاية: ٥٨٣/٤

[۲] ابن هشام، السيرة النبوية: ٤٤٠/٢

[۳] سنن أبي داود: ٣٥٦٢ـ٣٥٦٥، مسند أحمد: ١٥٣٠٢، ابن هشام، السيرة النبوية: ٤٤٠/٢

[۴] یاد رہے کہ دشمن کی مجموعی تعداد عورتوں اور بچوں سمیت تقریباً تیس ہزار تھی۔

[۵] ابن كثير، البداية والنهاية: ٥٨٣/٤، مسند أحمد: ١٢٩٧٧

مسلمانوں کو اپنی کثرتِ تعداد پر بھروسہ تھا۔ وادیِ حنین میں پہنچ کر وہ ایک گھاٹی کو تیزی سے طے کرنے لگے۔ رات ختم ہو چکی تھی مگر ابھی اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ دشمن وہاں پہلے پہنچ کر موڑوں اور پُر پیچ راستوں میں چھپا بیٹھا تھا۔ مسلمان بالکل بے فکر اور بے خبر چلے جا رہے تھے کہ اچانک دشمن کے تیراندازوں نے تیر برسانے شروع کر دیے۔ اس ناگہانی حملے نے مسلمانوں کو بدحواس کر دیا اور وہ بڑی ابتری سے بھاگنے لگے۔ صرف ایک سو کے قریب مسلمان میدان میں کھڑے رہ گئے تھے۔[1] آنحضرت ﷺ نے جب چاروں طرف سے حملہ آوروں کو بڑھتے اور اپنے لشکر کو بھاگتے دیکھا تو بے نظیر شجاعت و بہادری اور استقامت و پامردی کا ثبوت دیا۔ آپ ﷺ نے مسلمانوں کو مخاطب کر کے پکارنا شروع کیا:

''اے لوگو! کہاں؟ کہاں؟ اِدھر آؤ۔ میں اللہ کا رسول ہوں۔ میں محمد بن عبداللہ ہوں۔ میں عبدالمطلب کا پوتا ہوں۔''[2]

« أَنَا النَّبِيُّ لَا كَذِبْ أَنَا ابْنُ عَبْدِالْمُطَّلِبْ »

لیکن لوگ بڑی بدحواسی سے بھاگ رہے تھے، یہ دیکھ کر کفار خوش ہونے لگے۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ آنحضرت ﷺ کے خچر کی باگیں تھامے کھڑے تھے۔ وہ نہایت بلند آواز آدمی تھے۔ آپ ﷺ کے حکم کے مطابق حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے انصار کو بلایا اور کہا: ''اے انصار کے لوگو!'' یہ سنتے ہی انصار دوڑے دوڑے آئے اور آنحضرت ﷺ کے گرد جمع ہو گئے۔[3]

نیا حملہ

صبح کی روشنی پھیل چکی تھی۔ دشمن کمین گاہوں سے باہر نکل آیا۔ مسلمان فوج کو ازسرنو

---

1. التوبة :۹/۲۵_۲۷، صحيح البخاري:۲۸٦٤، صحيح مسلم:۱۷۷٥، مسند أحمد :۱٥٠۲۷
2. صحيح البخاري:٤۳۱٥، صحيح مسلم:۱۷۷٦ ، مسند أحمد :۱٥٠۲۷
3. صحيح البخاري:٤۳۱۷، صحيح مسلم:۱۷۷٥

ترتیب دیا گیا۔ انصار اور مہاجرین کو آگے بڑھایا گیا۔ جنگ پھر شروع ہوئی، دشمن سے مقابلہ ہوا۔ قتل و غارت کا بازار گرم ہوا۔ مسلمانوں کے جوش و خروش کا یہ عالم تھا کہ زرہیں اتار کر پھینک دیں، گھوڑوں سے کود پڑے۔ اب میدانِ جنگ کا نقشہ بدل گیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے آگے بڑھ کر ایک ہی وار میں ان کے علم بردار کا کام تمام کر دیا، اس سے کافروں کے دل ٹوٹ گئے، ہمت پست ہوگئی۔ کافروں کی فوج اس حملے کی تاب نہ لا کر بھاگ نکلی۔[1] ایک حصہ مالک بن عوف کی سرکردگی میں طائف کے قلعہ میں جا ٹھہرا۔ یہ سب لڑنے والے سپاہی تھے۔ دوسرا حصہ جس میں کافروں کے اہل و عیال اور مال و مویشی تھے۔ اَوطاس کی گھاٹی میں جا چھپا۔ اَوطاس طائف کے شمال مشرق میں کوئی چالیس میل کے فاصلے پر واقع ہے۔[2]

مالِ غنیمت

آنحضرت ﷺ نے ابو عامر اشعری رضی اللہ عنہ کو اَوطاس کی طرف روانہ کیا۔ ابو عامر رضی اللہ عنہ نے وہاں پہنچ کر دشمن کے اہل و عیال اور زر و مال پر قبضہ کر لیا۔ اس طرح مسلمانوں کو بڑا مال غنیمت ہاتھ آیا۔ ۲۴ ہزار اونٹ، ۴۰ ہزار بھیڑ بکریاں، ۴ ہزار اُوقیہ چاندی اور چھ ہزار عورتیں اور بچے مسلمانوں کو ملے۔[3]

محاصرۂ طائف

خود حضرت رسولِ اکرم ﷺ فوج لے کر طائف کی طرف روانہ ہوئے اور وہاں پہنچ کر قلعہ طائف کا محاصرہ کرنے کے لیے فوج کو حکم دیا۔

[1] ابن كثير، البداية والنهاية: ٥٩٣/٤، ابن سيد الناس، عيون الأثر: ١٩٠/٢-١٩٢، ابن هشام، السيرة النبوية: ٤٤٥/٢

[2] ابن سيد الناس، عيون الأثر: ١٩٢/٢، ابن كثير، البداية والنهاية: ٦٠٢/٤

[3] ابن سيد الناس، عيون الأثر: ١٩٣/٢، ابن هشام، السيرة النبوية: ٤٨٨/٢، البيهقي، دلائل النبوة: ١٧١/٥، محمد أحمد باشميل، غزوة حنين، ص: ١٩٨

طائف کا قلعہ بڑا مضبوط تھا۔ کافروں نے قلعہ بند کر کے لڑائی شروع کر دی۔ مسلمانوں نے قلعہ شکن آلات سے قلعہ پر بار بار حملے کیے لیکن قلعہ فتح نہ ہوا۔ قلعہ کے اندر سے کفار تیر برسانے لگے۔ آپ ﷺ نے حکم دیا کہ تیروں کی زد سے بچنے کے لیے محفوظ جگہ پر رہیں۔ اس طرح مسلمان ایک مہینے تک دشمنوں کا محاصرہ کیے رہے۔ جب حضرت رسولِ اکرم ﷺ نے دیکھا کہ اَوطاس میں مسلمانوں کو بڑا مالِ غنیمت ہاتھ لگا ہے تو آپ ﷺ نے سمجھا کہ کافروں کے لیے اہل و عیال کی گرفتاری اور مال و مویشی کا نقصان ایک بھاری مصیبت سے کم نہیں اور یہی سزا ان کے لیے کافی ہے۔ چنانچہ آپ ﷺ نے حکم دیا کہ طائف کا محاصرہ اُٹھا لیا جائے۔[1]

قیدیوں کی رہائی

ابھی حضرت رسولِ اکرم ﷺ میدانِ جنگ کے قریب ہی ٹھہرے ہوئے تھے کہ قبیلۂ ہوازِن کے چھ سردار آئے اور اُنھوں نے رحم کی درخواست پیش کی۔ آپ نے دوسرے دن ان کی درخواست پر یہ حکم دیا:

''میں اپنے اور خاندان عبدالمطلب کے قیدیوں کو بلا معاوضہ آزاد کرتا ہوں۔''[2]

یہ سن کر مہاجرین اور انصار نے کہا کہ ہم بھی اپنے اپنے قیدی بلا معاوضہ رہا کرتے ہیں۔ بنوسُلَیم اور بنوفَزارہ کے لیے یہ بات بالکل نئی تھی کہ دشمن کے جنگی قیدیوں کو بلا معاوضہ رہا کریں۔ آخر ان کے ہر ایک قیدی کا معاوضہ چھ اونٹ قرار پایا۔ یہ قیمت آنحضرت ﷺ نے ادا کر دی اور ہر قیدی کو اپنے پاس سے کپڑے دیے۔ اس طرح سب قیدیوں کو آزادی مل گئی۔[3]

دشمن کے جنگی قیدیوں سے اس قسم کا فیاضانہ سلوک اور خسروانہ برتاؤ آپ ﷺ کا حصہ

---

[1] صحيح البخاري: ٤٣٢٥، ابن الأثير، الكامل: ٢٦٦/٢، البيهقي، دلائل النبوة: ١٥٦/٥-١٦٩

[2] ابن هشام، السيرة النبوية: ٤٨٩/٢

[3] صحيح البخاري: ٤٣١٨-٤٣١٩، البيهقي، دلائل النبوة: ١٩٥/٥، ابن الأثير، الكامل: ٢٦٩/٢

تھا۔ تاریخ عالم اس کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔

رضاعی بہن کی عزت

ان قیدیوں میں مائی حلیمہ سعدیہ کی ایک بیٹی بھی تھی۔ حضرت رسولِ اکرم ﷺ نے اس رَضاعی بہن کو پہچان لیا۔ اس کے بیٹھنے کے لیے اپنی چادر زمین پر بچھا دی اور فرمایا کہ ''اگر تم میرے پاس ٹھہرو تو بہتر اور اگر اپنی قوم میں واپس جانا چاہو تو تمھیں اختیار ہے۔'' جب اس نے واپس جانے کا ارادہ ظاہر کیا تو آنحضرت ﷺ نے عزت واکرام کے ساتھ اس کی قوم میں واپس بھیج دیا۔[1] پھر آنحضرت ﷺ نے مکہ مکرمہ میں واپس آ کر عمرہ کیا۔[2]

مالِ غنیمت کی تقسیم

قیدیوں کے ساتھ اتنی بڑی رعایت کرنے کے بعد آنحضرت ﷺ نے مالِ غنیمت کی تقسیم شروع کی۔ آپ ﷺ نے سب سے پہلے ان لوگوں کو بہت سا مال مویشی دیے جو ابھی ابھی اِسلام لائے تھے۔ اس سے محض ان نومسلم سرداروں کی خاطر داری منظور تھی۔ ابوسفیان رضی اللہ عنہ کو ۴۰ اُوقیہ چاندی اور ایک سو اُونٹ دیے۔ اتنا اتنا ہی حصہ اس کے دو بیٹوں کو دیا گیا۔ اس کے بعد عام مسلمانوں کی باری آئی۔ ہر شخص کو ۴ اونٹ اور ۴۰ بکریاں ملیں۔ سواروں کو تین گنا زیادہ حصہ دیا گیا۔[3]

اس موقع پر انصار کو مالِ غنیمت میں سے کچھ بھی نہ دیا گیا۔ آنحضرت ﷺ نے انصار کو مخاطب کر کے فرمایا:

---

[1] سنن أبي داود: ۵۱۴۴_۵۱۴۵ ، ابن هشام ، السيرة النبوية: ۴۵۸/۲ ، البيهقي ، دلائل النبوة: ۱۹۹/۵

[2] صحيح البخاري: ۱۷۷۸ ، ابن هشام ، السيرة النبوية: ۴۵۸/۲ ، البيهقي ، دلائل النبوة: ۱۹۹/۵

[3] البيهقي ، دلائل النبوة: ۱۷۸/۵ ـ ۱۸۲ ، الواقدي ، المغازي: ۹۴۹/۳ ، ابن سيد الناس ، عيون الأثر: ۱۹۳/۲ ، أحمد باشميل ، غزوة حنين ، ص: ۲۵۷

”کیا تمھارے لیے یہ خوشی کی بات نہیں کہ اور لوگ بھیڑ بکریاں اور اونٹ لے کر جائیں اور تم رسول خدا ﷺ کو لے کر اپنے گھروں کو واپس جاؤ۔[1] تمھارا حصہ دوسرے لوگوں کے حصے سے کہیں بہتر ہے۔ انصار مغز ہیں اور تمام لوگ چھلکا۔ اے اللہ! انصار پر رحم فرما، انصار کی اولاد پر رحم فرما، انصار کی اولاد کی اولاد پر رحم فرما!“ [2]

یہ الفاظ سن کر انصار اتنے خوش ہوئے کہ مال و دولت لینے والوں کو یہ خوشی و مسرت نصیب نہ ہوئی تھی۔[3] پھر آپ ﷺ نے مدینے شریف کی راہ لی اور مکہ مکرمہ کا انتظام عتاب بن اَسید رضی اللہ عنہ کے سپرد کر دیا۔[4]

نتائج

غزوۂ حنین اور محاصرۂ طائف کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ سارے ملک عرب میں مسلمانوں کا طوطی بولنے لگا۔ تمام مخالف قوتیں زور آزمانے کے بعد ایک ایک کر کے ختم ہوگئیں۔ جزیرۂ عرب کی حکومت حضرت رسولِ اکرم ﷺ کے ہاتھ میں آ گئی۔

طائف کے محاصرے میں مسلمانوں نے نئے جنگی تجربے کیے۔ پہلی مرتبہ مَنْجَنِیق استعمال کی۔[5] یہ ایک آلہ تھا جس کے ذریعے قلعوں اور دیواروں کو گرایا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ مسلمانوں نے دوسرے قلعہ شکن آلات بھی استعمال کیے، مثلاً دَبّابہ اور ضُبور۔ دبابہ ایک ایسا آلۂ جنگ تھا جس کے اندر سپاہی بیٹھ کر قلعہ پر حملہ کرتے تھے۔ دبابہ قلعہ کی دیواروں میں سوراخ کر دیتا تھا۔ اس مشین کے اندر فوجی سپاہی بالکل محفوظ رہتے تھے۔ اس کی چھت دشمن کے تیروں اور نیزوں کو روک لیتی تھی۔ ضبور بھی دبابہ کی قسم کے آلات تھے۔ سپاہی ان میں

---

[1] صحيح البخاري:٤٣٣٣ـ٤٣٣٤، صحيح مسلم:١٠٥٩

[2] مسند أحمد:١١٧٣٠، أحمد باشميل، غزوة حنين:٢٧٣، ابن سيد الناس، عيون الأثر:١٩٥/٢

[3] ابن هشام، السيرة النبوية:٥٠٠/٢

[4] ابن حجر، الإصابة:٦٢/٧، ابن هشام، السيرة النبوية:٥٠٠/٢

[5] ابن هشام، السيرة النبوية:٤٨٣/٢

بیٹھ کر حفاظت کے ساتھ مخالفوں کے قلعوں تک پہنچ جاتے تھے۔[1]

ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ مسلمانوں نے اپنے چند کاریگروں کو منجنیق اور دوسرے آلات کے بنانے اور چلانے کے لیے جُرش کے علاقے میں تربیت حاصل کرنے کے لیے بھیجا۔[2]

فرضیتِ زکوٰۃ

نماز اور روزے کی طرح زکوٰۃ بھی شروع ہی سے کسی نہ کسی شکل میں جاری ہو چکی تھی۔ ابتداء میں صرف صدقہ و خیرات کی صورت میں تھی، پھر آہستہ آہستہ زکوٰۃ کی مقدار، مدت، نصاب اور خرچ کی تفصیلات کے بارے میں احکام نازل ہوتے رہے۔ بالآخر فتح مکہ کے بعد سن ۸ ہجری میں زکوٰۃ ہر مالدار مسلمان پر فرض کر دی گئی۔[3]

اسلامی معاشرے میں تھوڑا بہت اقتصادی توازن اور مساوات قائم رکھنے کے لیے ضروری تھا کہ کوئی ایسا طریقہ اختیار کیا جائے جس کے ذریعے مالداروں کا مال و دولت قوم کے غریب اور نادار لوگوں کے کام آ سکے۔ مالدار ہاتھ سے دے کر خوش ہوں اور مفلس و بے کس لے کر مجرم اور قابل گرفت قرار نہ دیے جائیں۔ اس مقصد کی ابتداء صدقہ و خیرات پھر صدقہ فطر سے ہو چکی تھی۔ سن ۸ ہجری میں زکوٰۃ فرض قرار دے کر اس مقصد کی تکمیل کر دی گئی۔

---

[1] الواقدي، المغازي: ۹۲۳/۳ ، محمود شیت خطاب ، قادة النبي ﷺ، ص: ٦١٥، الألوسي، بلوغ الأرب: ۵۸/۲، القلقشندي ، صبح الأعشى :۱۵۲/۲ ، المعجم الوسيط: ۲٦٧/۱ـ ۵۳۵ ، فيروز آبادي، القاموس المحيط :۷٤/۲

[2] ابن كثير، البداية والنهاية :٦١١/٤

[3] البقرة :۲٦٧/۲ ، التوبة :٦٠/٩ ، صحيح البخاري :۱٤٤٧ـ۱٤٤٨، ۱٤٥٤، صحيح مسلم: ۹۷۹ـ۹۹۲، سنن ابن ماجه :۲٤٣۷ـ۲۵۲۲

غزوۂ تبوک

آنحضرت ﷺ نے سرحدِ شام کی طرف لشکر کشی کی جو غزوۂ تبوک کے نام سے مشہور ہے۔ واقعات یوں ہیں کہ سن ۹ ہجری میں یہ افواہ گرم ہوئی کہ شام کی سرحد پر حدودِ فلسطین کے ساتھ رومیوں کا ایک بہت بڑا لشکر مسلمانوں سے قوت آزمانے کے لیے جمع ہو رہا ہے اور بعض عربی قبائل رومی لشکر کے ساتھ مل گئے ہیں۔ پھیلتے پھیلتے یہ افواہ حضرت رسولِ مقبول ﷺ تک پہنچی۔ آپ ﷺ نے اس افواہ پر اس لیے اعتبار کر لیا کہ جنگِ مؤتہ کے بعد رومیوں کی طرف سے حملے کا خطرہ ہر وقت محسوس کیا جا رہا تھا۔ عرب قبائل میں رومیوں کے حملے کی افواہیں عام طور پر اُڑتی رہتی تھیں۔ جب یہ افواہ پھیلی کہ رومیوں کا لشکرِ جرار فلسطین کی سرحدوں پر جمع ہو رہا ہے تو عین اس وقت شامی سوداگروں کا ایک قافلہ مدینہ منوّرہ میں ٹھہرا ہوا تھا۔ اس قافلے والوں نے اس بات کی تصدیق کر دی کہ واقعی چالیس ہزار کا ایک لشکر سرحدِ شام پر ڈیرے ڈالے پڑا ہے۔ اس شہادت کے بعد آپ ﷺ کو جنگ کی تیاری کیے بغیر اور کوئی چارہ کار نظر نہ آیا۔[1]

چنانچہ آپ ﷺ نے جنگی حالات کا اعلان کر کے مسلمانوں کو جنگ کی تیاری کا حکم دے دیا۔ ایک طرف تو یہ سخت قحط اور تنگدستی کا زمانہ تھا، گرمی بھی شدت کی تھی اور سفر بھی بہت لمبا۔ بہت سے غریب مسلمان اتنے طویل سفر کی طاقت نہ رکھتے تھے۔ دوسری طرف منافقین نے مسلمانوں کو بہکانے کی ہر ممکن کوشش کی۔[2]

---

[1] الواقدي، المغازي: ۳/۹۹۰

[2] التوبة: ۹/۴۱-۴۹ ، ابن سعد ،الطبقات الکبرٰی :۲/۱۶۵، ابن کثیر، البداية والنهاية : ۴/۶۵۳،۶۵۴، تاريخ الطبري :۳/۱۰۱

ضروریات کے پیشِ نظر آنحضرت ﷺ نے چندے کی اپیل کرتے ہوئے مالداروں کو حکم دیا کہ دل کھول کر راہِ خدا میں خرچ کریں۔ اکثر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بڑی بڑی رقوم دیں۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے دس ہزار اشرفیاں، تین سو اونٹ اور پچاس گھوڑے پیش کیے۔[1]

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اپنا نصف مال لاکر حاضر کر دیا۔[2] حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے گھر کا سارا مال و متاع لاکر آپ ﷺ کے قدموں میں ڈھیر کر دیا۔ جب آنحضرت ﷺ نے دریافت فرمایا: ''بال بچوں کے لیے کیا چھوڑ آئے ہو؟'' تو عرض کیا کہ صدیق کو خدا اور خدا کا رسول بس۔[3]

اعلانِ جنگ سن کر مسلمانوں کا تیس ہزار کا لشکر جمع ہو گیا۔ اس میں دس ہزار سوار بھی تھے۔ آپ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اپنے پیچھے چھوڑا اور خود تیس ہزار کا لشکر لے کر شام کی طرف روانہ ہوئے۔ چلتے چلتے آپ ﷺ تبوک پہنچے۔ یہ مقام مدینے اور فلسطین کے درمیان تقریباً چار سو میل (٦٤٥ کلومیٹر) کے فاصلے پر واقع ہے۔ تبوک پہنچ کر معلوم ہوا کہ یہ افواہ غلط تھی۔ آپ ﷺ نے تبوک میں بیس دن قیام فرمایا۔ سرحدی قبائل کے کئی سرداروں نے حاضرِ خدمت ہو کر اطاعت اختیار کی اور جزیہ دینا قبول کیا۔ آپ ﷺ نے اَیلہ قوم کے سردار کو ایک اَمان نامہ بھی تحریر فرما دیا۔[4]

خطبۂ تبوک

آپ ﷺ نے تبوک میں ایک اہم اور یادگار خطبہ بھی ارشاد فرمایا جس کا ایک ایک

---

[1] جامع الترمذي: ٣٧٠٠-٣٧٠١، مسند أحمد: ٢٠٦٣٠، ١٦٦٩٦، الديار بكري، تاريخ الخميس: ١٢٢/٢

[2] جامع الترمذي: ٣٦٧٥

[3] سنن أبي داود: ١٦٧٨

[4] ابن كثير، الفصول، ص: ٢١٠-٢١٢، ابن الجوزي، الوفا: ٢٤٧/٢، ابن إسحاق، السيرة النبوية، ص: ٦٠٤-٦٠٥، ابن سيد الناس، عيون الأثر: ٢١٦/٢، الوقدي، المغازي: ١٠٢٧/٢

لفظ پند و نصیحت کا بحرِ ذخار ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

''امّا بعد: اے لوگو! سب سے سچی کتاب قرآن ہے۔ سب سے بڑا سہارا تقویٰ ہے۔ سب سے اچھا دین دینِ ابراہیمی ہے۔ سب سے بہتر طریقہ محمدی طریقہ ہے۔ سب سے اچھی بات ذکرِ الٰہی ہے۔ سب سے عمدہ داستان قرآن ہے۔ سب سے اچھے کام عزیمت کے کام ہیں۔ دین میں نئے رخنے (بدعت) بدترین چیز ہے۔ بہترین راہ انبیاء علیہم السلام کی راہ ہے۔ معزز ترین موت شہادت کی موت ہے۔ ہدایت کے بعد گمراہی بدترین قسم کی محرومیِ بصارت ہے۔ سب سے اچھا کام وہ ہے جو نفع پہنچائے۔ سب سے اچھی راہ وہ ہے جس پر چلیں۔ دل کی تاریکی بدترین تاریکی ہے۔ دینے والا ہاتھ لینے والے ہاتھ سے بہتر ہے۔ ضرورت پوری کرنے والی تھوڑی چیز بھی غفلت میں ڈالنے والی زیادہ چیز سے بہتر ہے۔ موت کے وقت کی توبہ بدترین توبہ ہے اور بدترین ندامت قیامت کے دن کی ندامت ہے۔ ایسے لوگ بھی ہیں جو جمعہ میں آخری وقت میں شامل ہوتے ہیں اور ایسے بھی ہیں جو خدا کو بہت کم یاد کرتے ہیں۔ سب سے بڑا گناہ جھوٹی زبان ہے۔ سب سے بڑی دولت دل کی دولت ہے۔ بہترین توشہ تقویٰ ہے۔ خوفِ خدا حکمت و دانائی کی اساس و بنیاد ہے۔ دل میں جاگزین ہونے والی سب سے اچھی چیز یقین ہے۔ شک ایک گونہ کفر ہے۔ میت پر نوحہ کرنا جاہلیت کی رسم ہے۔ خیانت کرنا دوزخ کی آگ مول لینا ہے۔ شراب گناہوں کا سرچشمہ ہے۔ یتیم کا مال کھانا بدترین روزی ہے۔ سعادت مند اور خوش نصیب وہ ہے جو دوسروں سے عبرت حاصل کرے۔ عمل کا دار و مدار خاتمہ پر ہے۔ جھوٹا خواب بدترین خواب ہے۔ مسلمان کو گالی دینا جرم

ہے۔ مسلمان کو قتل کرنا کفر ہے۔ کسی مسلمان کی غیبت کرنا گناہ ہے۔ مسلمان کا مال و جان دونوں قابل عزت و احترام ہیں۔ جو شخص کسی دوسرے کو معاف کرتا ہے اللہ تعالیٰ اسے معاف کرے گا۔ جو غصہ پی جاتا ہے اللہ تعالیٰ اسے اجر دے گا۔ جو کوئی مصیبت پر صبر کرتا ہے اللہ تعالیٰ کے ہاں اچھا بدلہ پائے گا اور جو شخص اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرتا ہے اللہ اسے عذاب دے گا۔'' [1]

اس کے بعد آپ ﷺ نے تین مرتبہ استغفار پڑھ کر خطبہ ختم کیا۔ [2]

یہ خطبہ اس قابل ہے کہ اسے بار بار پڑھا جائے۔ اس کے ہر ہر لفظ پر غور کیا جائے۔ یہ پیغامِ اسلام کا خلاصہ ہے اور اسلامی فلسفۂ حیات کو چند الفاظ میں بیان کر دیا گیا ہے۔ ایک ایک جملہ اپنے اندر نصیحت و موعظت کے سمندر لیے ہوئے ہے۔

آنحضرت ﷺ تبوک میں بیس دن قیام فرمانے کے بعد جب مدینے واپس تشریف لائے تو مسلمانوں نے بڑی خوشی و مسرت کا اظہار کیا۔ وجہ یہ تھی کہ یہ سفر بڑا لمبا تھا اور بے شمار خطرے درپیش تھے۔ جب آپ ﷺ مدینے کے قریب پہنچے تو شہر میں بڑی خوشیاں منائی گئیں۔ مرد، عورتیں، بچے، بوڑھے سب استقبال کے لیے باہر نکل آئے۔ [3]

فرضیتِ حج

اِسلام میں حج ۹ ھ کو فرض ہوا۔ [4] اسی سال حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو حاجیوں کا امیر بنا کر تین سو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ حج کے لیے مکے بھیج دیا۔ [5]

[1] البيهقي، دلائل النبوة: ٥/٢٤١، ابن كثير، السيرة النبوية: ٤/٢٤

[2] البيهقي، دلائل النبوة: ٥/٢٤٢

[3] صحيح البخاري: ٣٠٨٣، سنن أبي داود: ٢٧٧٩، ابن الجوزي، الوفا: ٢/٢٤٧

[4] ابن كثير، البداية والنهاية: ٤/٦٩٥

[5] صحيح البخاري: ٤٣٦٣

ان کے بعد حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کو روانہ کیا کہ وہ سورۂ براءۃ (دوسرا نام سورۂ توبہ ہے) کا اعلان کریں۔ جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ حج سے فارغ ہوئے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے سورۂ براءۃ کی پہلی چالیس آیات پڑھ کر سنائیں اور ان کے احکام کی وضاحت فرمائی کہ اس سال کے بعد کوئی مشرک بیت اللہ میں داخل نہ ہونے پائے گا اور کوئی شخص برہنہ ہو کر خانہ کعبہ کا طواف نہ کر سکے گا۔[1]

کیونکہ زمانۂ جاہلیت میں بالکل برہنہ ہو کر طواف کرنے کا رواج تھا۔

وفود کی آمد

سن ۹ اور سن ۱۰ ہجری میں عرب کے مختلف قبائل کے وفود آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر اظہارِ اطاعت کرنے لگے اور اکثر نے اِسلام قبول کر لیا۔

جب تک اِسلام اور کفر کی آویزش رہی، قبائل عرب بڑی بے تابی سے نتیجہ کے منتظر تھے۔ جب حق غالب آگیا اور باطل شکست خوردہ ہو کر بھاگ گیا تو جمہور قبائل نے اِسلام کی صداقت اور سچائی تسلیم کر لی اور اپنے اپنے قبیلے کے نمائندہ اور سردار بھیج کر آنحضرت ﷺ کے حضور میں اپنی اِسلام دوستی اور ایمان کا اعتراف واقرار کیا۔[2]

ہجرت کے بعد حضرت رسولِ اکرم ﷺ نے صرف ایک مرتبہ سن ۱۰ ہجری میں حج کیا۔ اسی موقع پر آپ ﷺ لوگوں سے رُخصت ہوئے اور اَلوداع کہا۔ جس کی مناسبت سے حج کا نام حجۃ الوداع پڑ گیا۔[3]

حَجّۃ الوَداع

سن ۱۰ ہجری ذوالقعدہ کے مہینے میں یہ اعلان کیا گیا کہ حضرت رسولِ اکرم ﷺ حج کے

۱۔ صحيح البخاري: ٤٦٥٦، ابن كثير، البداية والنهاية: ٤/٦٩٨

۲۔ البيهقي، دلائل النبوة: ٥/٣٠٩ـ٤١٨، ابن الجوزي، الوفا: ٢/٢٧٥ـ٢٨٢، ابن كثير، البداية والنهاية: ٥/٧ـ٩٦

۳۔ ابن كثير، البداية والنهاية: ٥/١١٤، البيهقي، دلائل النبوة: ٥/٣٠٩ـ٣٨٢

لیے مکہ مکرمہ تشریف لے جائیں گے۔ یہ خبر سنتے ہی سارے عرب کے مسلمان ساتھ چلنے کے لیے تیار ہو گئے۔ آپ ﷺ نے روانگی سے پہلے غسل فرمایا۔ خطبہ دیا اور احرام اور اس کے احکام بیان فرمائے۔ ظہر کی نماز اپنی مسجد میں جماعت سے پڑھی۔ پھر گھر کے اندر تشریف لے گئے، تیل لگایا، کنگھی کی، چادر اور تہ بند باندھا اور عصر کی نماز سے پہلے پہلے روانہ ہو گئے۔ مدینے سے چھ میل کے فاصلے پر ذوالحلیفہ کے مقام پر جا ٹھہرے اور وہیں رات گزاری۔[1]

دوسرے دن پھر غسل فرمایا۔ چادر اور تہ بند باندھا اور اونٹنی پر سوار ہو کر یہ پڑھتے ہوئے روانہ ہوئے:

«لَبَّیْکَ اَللّٰھُمَّ لَبَّیْکَ، لَبَّیْکَ لَا شَرِیْکَ لَکَ لَبَّیْکَ، إِنَّ الْحَمْدَ وَالنِّعْمَةَ لَکَ وَالْمُلْکَ لَا شَرِیْکَ لَکَ»[2]

"اے اللہ! میں حاضر ہوں، میں حاضر ہوں۔ تیرا کوئی شریک نہیں۔ میں حاضر ہوں۔ سب تعریف اور نعمت تیرے ہی لیے ہے۔ حکومت بھی تیری ہے۔ تیرا کوئی ساجھی نہیں۔"

جدھر نظر اُٹھا کر دیکھو، آدمیوں کا جنگل نظر آتا تھا۔ جب آنحضرت ﷺ لَبَّیْکَ فرماتے تھے تو آپ ﷺ کے ساتھ کم و بیش ایک لاکھ انسان یہی نعرہ بلند کرتے تھے اور فضا نعروں سے گونج اُٹھتی تھی۔ اسی طرح سارا سفر طے ہوا۔

آنحضرت ﷺ ذوالحجہ کی ۵ تاریخ سوموار کو مکہ میں داخل ہوئے۔ وہاں پہنچ کر حکم دیا کہ جن کے ساتھ قربانی کے جانور نہیں وہ صرف عمرہ پر اکتفا کریں۔ طواف کریں، صفا و مروہ کی پہاڑیوں کے درمیان دوڑیں اور احرام اُتار دیں۔[3]

---

[1] صحیح البخاري: ١٥٤٥ و ١٥٤٦، ١٥٤٧، صحیح مسلم: ١٢١٨

[2] صحیح البخاري: ١٥٤٩، صحیح مسلم: ١١٨٤

[3] صحیح البخاري: ١٥٤٥۔ ٧٢٣٠

مکہ میں داخل ہونے کے بعد کعبہ نظر آیا تو جوشِ محبت سے فرمایا:

”اے اللہ! اس گھر کی بزرگی، عزت و حرمت اور جلال و عظمت اور زیادہ کر دے۔“[۱]

پھر کعبہ کا طواف کیا، مقامِ ابراہیم میں کھڑے ہو کر دو رکعت نماز ادا کی، پھر صفا پہاڑی پر چڑھ کر فرمایا:

« لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيْكَ لَهُ ، لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ، وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ »

”ایک اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اس کا کوئی ساجھی نہیں۔ اُسی کی حکومت ہے۔ وہی تعریف کا مالک ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔“

« لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ ، أَنْجَزَ وَعْدَهُ وَنَصَرَ عَبْدَهُ وَهَزَمَ الْأَحْزَابَ وَحْدَهُ »[۲]

”اللہ واحد کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اس نے اپنا وعدہ پورا کیا اور اپنے بندے کی مدد فرمائی اور اکیلے ساری جماعتوں کو شکست دی۔“

پھر دوڑتے ہوئے مروہ کی طرف چلے۔ اس طرح سات چکر پورے کیے۔ عمرہ سے فارغ ہو کر آپ ﷺ نے اپنے ساتھیوں کو، جن کے ساتھ قربانی کے جانور نہ تھے، احرام کھول دینے کی ہدایت فرمائی اور اپنی بابت فرمایا کہ اگر پہلے سے یہ معلوم ہوتا تو جانور ساتھ نہ لاتا، عمرہ کے بعد احرام کھول دیتا اور وقت پر جانور خرید لیتا۔[۳]

حضرت رسولِ اکرم ﷺ جب تک مکے میں ٹھہرے رہے نماز برابر اپنی قیام گاہ پر پڑھتے رہے۔ جمعرات کے دن ۸ ذوالحجہ کو آپ ﷺ سارے مسلمانوں کو لے کر منیٰ کو روانہ

---

[۱] الطبراني، المعجم الكبير:۳۰۵۳

[۲] صحيح مسلم:۱۲۱۸

[۳] صحيح البخاري:۱۵٤۵، ۷۲۳۰، سنن أبي داود:۱۷۸۳، سنن النسائي:۲۷۱۳

ہوئے۔ وہاں پہنچ کر ظہر اور عصر کی نمازوں کو جمع کیا، رات وہیں بسر کی۔

دوسرے دن ۹ ذوالحجہ کو صبح کی نماز پڑھ کر منیٰ سے روانہ ہوئے اور ایک لاکھ چالیس ہزار ہمراہیوں کے ساتھ عرفات آ کر ٹھہرے۔ دوپہر ڈھل گئی تو آنحضرت ﷺ اپنی اونٹنی پر سوار ہو کر میدان میں آئے۔ اونٹنی پر بیٹھے بیٹھے حج کا خطبہ دیا۔[1]

خطبۂ حج

آپ ﷺ نے آخری حج کے موقع پر فرمایا:

''اے لوگو! میری بات سنو! عین ممکن ہے کہ میں اس سال کے بعد اس جگہ تم سے پھر کبھی نہ مل سکوں۔[2] اے لوگو! تمھارا خون، تمھارا مال اور تمھاری عزت یعنی ایک دوسرے کو قتل کرنا اور ایک دوسرے کا مال لوٹنا اور ایک دوسرے کی عزت پر ہاتھ ڈالنا قیامت تک کے لیے تم پر اسی طرح حرام ہے جس طرح آج کے دن اس مہینے میں اور اس شہر میں خون بہانا حرام ہے۔ تم عنقریب اپنے رب کے سامنے جاؤ گے اور وہ تم سے تمھارے اعمال کی بابت پوچھے گا۔ میں نے حق بات تمھیں پہنچا دی ہے۔[3] جس کسی کے پاس امانت ہو وہ اس کے مالک تک پہنچا دے۔ ہر قسم کا سُود باطل ہے۔ تم اپنا اصل مال لے لو، سود چھوڑ دو۔ اس طرح نہ تم پر ظلم ہوگا اور نہ تم دوسروں پر ظلم کرو گے۔ اللہ کا فیصلہ یہی ہے کہ سود جائز نہیں۔[4] جاہلیت کے سارے خون چھوڑے جاتے ہیں۔ شیطان کے فریب

[1] صحيح مسلم:١٢١٨ ، سنن أبي داود:١٩١٥ ، ابن كثير، البداية والنهاية :٥/٢٣١

[2] مسند أحمد: ٢٢٢٦٠

[3] صحيح البخاري:٤٤٠٦، صحيح مسلم:١٢١٨

[4] مسند أحمد : ٢٠٦٩٥ ، تاريخ الطبري :٣/١٥٠

سے بچتے رہو۔[۱] اے لوگو! تمھاری عورتوں پر تمھارا کچھ حق ہے اور عورتوں کا تم پر کچھ حق ہے۔ تمھارا حق یہ ہے کہ وہ تمھاری عزت کی حفاظت کریں۔ ان کا حق یہ ہے کہ تم انھیں اچھی طرح کھلاؤ، پلاؤ اور پہناؤ۔ عورتوں سے اچھا سلوک کرو۔ ان کے بارے میں اللہ سے ڈرتے رہو۔ اے لوگو! میری بات اچھی طرح ذہن نشین کرلو، میں نے حق بات پہنچا دی ہے۔ میں تم میں ایسی چیز چھوڑے جاتا ہوں کہ اگر تم اسے مضبوطی سے تھامے رہو گے تو گمراہ نہ ہونے پاؤ گے۔ یعنی اللہ کی کتاب اور میرا طریق۔[۲] لوگو! میری بات سنو اور خوب سمجھ لو کہ ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے اور تمام مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔[۳] اپنے غلاموں کے حق میں انصاف کرو۔ جو خود کھاؤ وہی ان کو کھلاؤ اور جو خود پہنو وہی ان کو پہناؤ۔[۴] سب مسلمان برابر ہیں۔ کسی عربی کو عجمی پر کوئی بڑائی اور فخر حاصل نہیں۔[۵] قرض خواہ کو قرض ادا کیا جائے۔ ادھار مانگا ہوا مال واپس کیا جائے گا۔ جو ضامن بنے وہ تاوان کا ذمہ دار ہو۔[۶] لوگو! نہ تو میرے بعد کوئی اور پیغمبر ہے اور نہ کوئی نئی اُمت پیدا ہوگی۔

---

[۱] صحيح مسلم: ١٢١٨، مسند أحمد: ٢٠٦٩٥، تاريخ الطبري: ١٥٠/٣

[۲] صحيح مسلم: ١٢١٨، تاريخ الطبري: ١٥١/٣

[۳] البيهقي، دلائل النبوة: ٤٤٩/٥، تاريخ الطبري: ١٥١/٣

[۴] عبدالرزاق، المصنف: ١٧٩٣٤، مسند أحمد: ١٦٤٠٩

[۵] مسند أحمد: ٢٣٤٨٩، الصالحي، سبل الهدى: ٤٨٢/٨

[۶] البيهقي، دلائل النبوة: ٤٤٧/٥

کان کھول کر سن لو! اپنے رب کی عبادت کرو۔ پنجگانہ نماز ادا کرو۔ سال بھر میں ایک مہینہ رمضان کے روزے رکھو۔ اپنے مال کی زکوٰۃ نہایت خوشی کے ساتھ دیا کرو۔ بیت اللہ شریف کا حج بجالاؤ۔ اپنے حاکموں کی فرمانبرداری کرو۔ تمھیں اس کے بدلے جنت ملے گی۔"[1]

اسی موقع پر اللہ تعالیٰ نے یہ خوشخبری سنائی:

﴿ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَ رَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ﴾[2]

"اے مسلمانو! آج میں نے تمھارے لیے دین کو مکمل کر دیا اور اپنی نعمت تم پر پوری کر دی اور تمھارے لیے اِسلام کو بطور دین پسند کیا۔"

خطبہ سے فارغ ہوئے تو حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے اذان دی اور آنحضرت ﷺ نے ظہر اور عصر کی نمازیں ایک ساتھ ادا فرمائیں۔

قربانی کے دن حضرت رسولِ اکرم ﷺ نے ۶۳ اونٹ اپنے ہاتھ سے اور ۳۷ اونٹ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ کی طرف سے ذبح کیے، یہ قربانی منیٰ پر کی گئی تھی۔

ظہر سے پہلے مکے کی طرف روانہ ہوئے۔ وہاں پہنچتے ہی طواف کیا۔ پھر زَم زَم پر آئے، پانی پیا۔ اس کے بعد پھر منیٰ تشریف لے گئے اور رات وہیں بسر کی۔ صبح ہوئی تو پھر کنکریاں پھینکنے تشریف لے گئے۔ منیٰ میں کل تین دن ٹھہرے رہے۔ پھر منگل کے دن ظہر کے بعد کوچ کر دیا۔[3]

---

[1] ابن أبي عاصم، كتاب السنة: ١٠٦١، الطبراني، المعجم الكبير: ٧٦٢٢، ٧٩٧

[2] المائدة ٥: ٣، صحيح البخاري: ٤٤٠٧، ابن كثير، البداية والنهاية: ٥/٢٩٨

[3] صحيح مسلم: ١٢١٨

مدینے کو واپسی

مکے واپس تشریف لا کر رات کو پچھلے پہر طواف الوداع کیا۔ پھر ۱۴ ذوالحجہ کو فجر کی نماز خانہ کعبہ میں پڑھ کر سب لوگ اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہوئے اور آنحضرت ﷺ بھی مہاجرین اور انصار کے ساتھ مدینے تشریف لے چلے۔[1]

مدینے کے راستے میں مقام رَوْحاء پر ایک قافلہ ملا، جس میں سے ایک عورت نے اپنے شیر خوار بچے کو پیش کر کے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! کیا اس کا بھی حج ہو گیا؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''ہاں اس کا بھی حج ہو گیا اور تجھے ثواب ملا۔''[2]

واپسی پر ذوالحلیفہ میں رات بسر کی۔ صبح جب مدینہ نظر آیا تو تین بار تکبیر کہی اور فرمایا:

''ایک اللہ کے سوا اور کوئی معبود نہیں۔ اُسی کی بادشاہی ہے۔ وہی تعریف کے لائق ہے۔ وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ ہم واپس آ رہے ہیں۔ توبہ کر رہے ہیں۔ سجدہ کر رہے ہیں۔ خدا نے اپنا وعدہ سچا کر دکھایا۔ اپنے بندے کی مدد کی اور جماعتوں کو تن تنہا شکست دی۔''[3]

مرضُ الموت

مدینہ منورہ میں واپس تشریف لائے تین ماہ بھی نہ ہونے پائے تھے کہ آپ ﷺ نے سفر آخرت کی تیاری شروع کی۔ آپ ﷺ اُحد پہاڑ کی طرف تشریف لے گئے اور غزوۂ اُحد کے شہیدوں کے لیے دعا کی۔[4] اس کے بعد ایک رات جنت البقیع کے مشہور

---

1. صحيح البخاري:١٧٥٦، البيهقي، دلائل النبوة :٥/٤٥٢
2. صحيح مسلم:١٣٣٦
3. صحيح البخاري:١٧٩٧، صحيح مسلم :١٣٤٤
4. صحيح البخاري:١٣٤٤

قبرستان میں تشریف لے گئے اور مسلمانوں کے لیے دعائے مغفرت فرمائی۔[1] واپس آئے تو طبیعت ناساز ہوگئی۔ یہ بدھ کا دن تھا۔ پیر کے دن بیماری زیادہ بڑھ گئی۔ سخت درد سر اور تپ کی شدت نے بہت نڈھال کر دیا تھا۔ درد سر کی وجہ سے آپ ﷺ نے سر پر رومال باندھ رکھا تھا۔ بخار کی شدت کا یہ حال تھا کہ جسم مبارک سے سینک آتا تھا۔ سب کی رائے سے آپ ﷺ کو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے حجرے میں پہنچا دیا گیا۔[2]

جب تک آنے جانے کی طاقت رہی مسجد میں نماز پڑھانے کے لیے تشریف لاتے رہے۔ سب سے آخری نماز آپ ﷺ نے مغرب کی پڑھائی۔ عشاء کی نماز کے وقت طبیعت بہت خراب ہوگئی اور حکم دیا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نماز پڑھائیں۔ چنانچہ کئی دن تک حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے نماز پڑھائی۔[3]

وفات سے چار پانچ روز پہلے حضرت رسولِ اکرم ﷺ نے فرمایا:

"تم سے پہلے ایسے لوگ ہوگزرے ہیں جو انبیاء اور نیک لوگوں کی قبروں پر سجدہ کرتے تھے تم ایسا نہ کرنا۔[4] خدا ان یہودیوں اور عیسائیوں پر لعنت کرے جنھوں نے انبیاء کی قبروں کو سجدہ گاہ بنایا۔[5] اے اللہ! میرے بعد میری قبر بُت نہ بننے پائے۔"[6]

انھی دنوں کا ذکر ہے کہ حضرت رسولِ اکرم ﷺ سر پر پٹی باندھے حضرت عباس رضی اللہ عنہ

---

[1] البيهقي ، دلائل النبوة :۱٦۲/۷ ، المستدرك للحاكم :٤٤٠ ، مسند أحمد :۱٥۹۹٦، الطبراني ، المعجم الكبير :۸۷۱

[2] ابن الجوزي ، الوفا بأحوال المصطفى :۲۹۲/۲، البيهقي ، دلائل النبوة :۱۷۳/۷

[3] صحيح البخاري:۷۱٦، صحيح مسلم:٤۱۸ ، البيهقي ، دلائل النبوة :۱۹۷/۷

[4] صحيح مسلم:٥۳۲

[5] صحيح البخاري:٤۳٥۔٤۳٦ ، صحيح مسلم:٥۲۹ ، سنن النسائي:۲۰٤۸

[6] مسند أحمد :۷۳٥۸ ، مسند حميدي:۱۰۲٥

اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے کندھوں پر سہارا دیے ہوئے مسجد میں تشریف لائے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نماز پڑھا رہے تھے۔ اُنھوں نے پیچھے ہٹنا چاہا مگر حضرت رسولِ اکرم ﷺ نے انھیں روک دیا اور ان کے برابر بائیں ہاتھ بیٹھ کر نماز پڑھائی۔[1] نماز کے بعد آپ ﷺ نے فرمایا:

''اے لوگو! مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم اپنے نبی ﷺ کی موت سے خوفزدہ اور ہراساں ہو رہے ہو۔ کیا مجھ سے پہلے کسی نبی کو ہمیشہ کی زندگی نصیب ہوئی جو میں تم میں ہمیشہ ہمیشہ رہوں؟ کان کھول کر سن لو! میں اپنے رب کے پاس جانے والا ہوں۔ تم وہاں آ کر مجھے ملنے والے ہو۔''[2]

اس ارشاد کے بعد آپ ﷺ نے انصار اور مہاجرین کے متعلق مفصل ہدایات اور نصیحتیں فرمائیں۔[3] پھر فرمایا:

''مسلمانو! میں تمھیں خدا کے سپرد کرتا ہوں۔ خدا کی پناہ ونگہداشت اور نصرت کے حوالے کرتا ہوں۔ خدا تمھارا محافظ ہے۔ تمھاری پرہیزگاری اور فرمانبرداری کی وجہ سے وہ تمھاری حفاظت ونگرانی کرے گا۔ بس اب میں دُنیا سے علیحدہ ہونے والا ہوں اور اسے چھوڑ جانے والا ہوں۔''[4]

خطبہ سے فارغ ہو کر آپ ﷺ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے حجرے میں تشریف لے گئے۔ گھر میں جو کچھ بھی تھا وہ راہِ خدا میں دے دیا گیا۔[5]

---

[1] صحيح البخاري:۱۹۸، ۶۷۸ـ۶۸۲، صحيح مسلم:٤١٨

[2] الصالحي، سبل الهدى :۲۵۲/۱۲

[3] صحيح البخاري:۳۷۹۹، ۳۸۰۱، البيهقي، دلائل النبوة :۱۷۷/۷، الصالحي، سبل الهدى: ۲۵۲/۱۲

[4] تاريخ الطبري :۱۹۲/۳، ابن الأثير، الكامل :۳۱۹/۲

[5] مسند أحمد:۲٤۲۲۲، ۲٥٤۹۲، الصالحي، سبل الهدى :۲۵۲/۱۲

آخری دِن

حضرت رسولِ اکرم ﷺ کی بیماری گھٹتی بڑھتی رہی۔ پیر کے دن حالت بظاہر بہتر ہوگئی۔ آپ ﷺ کا حجرہ مبارک مسجد سے ملا ہوا تھا۔ آپ ﷺ نے صبح کے وقت مسجد کی جانب والا پردہ اُٹھا کر دیکھا تو لوگ فجر کی نماز پڑھ رہے تھے۔ یہ دیکھ کر آنحضرت ﷺ خوش ہوکر مسکرائے کہ لوگ آپ ﷺ کی پاک تعلیم پر عمل کر رہے ہیں۔ پھر آپ ﷺ پردہ چھوڑ کر لیٹ گئے اور نماز میں شامل نہ ہو سکے۔[1]

اس کے بعد دن جیسے جیسے چڑھتا گیا آپ ﷺ پر غشی طاری ہوتی گئی۔ نزع کی حالت میں پانی کا ایک پیالہ سرہانے رکھا ہوا تھا، حضرت رسولِ اکرم ﷺ اس پیالے میں ہاتھ ڈالتے اور چہرے مبارک پر پھیر لیتے تھے۔[2] چہرۂ مبارک کبھی سرخ اور کبھی زرد پڑ جاتا تھا۔ طبیعت ناساز ہوئے بارہ دن گزر چکے تھے۔

وفات

پیر کے دن ۱۲ ربیع الاول، سن ۱۱ ہجری (بمطابق ۸ جون ۶۳۲ء) کو سہ پہر کا وقت تھا۔ سینے میں سانس کی گڑگڑاہٹ محسوس ہوتی تھی، اتنے میں لب مبارک ہلے۔[3] آپ ﷺ فرما رہے تھے:

"نماز، نماز۔ لونڈی غلام کے حقوق۔"[4]

پھر فرمایا:

«اَللّٰهُمَّ الرَّفِيْقَ الْأَعْلٰى»

---

[1] صحيح البخاري: ٦٨٠، ٦٨١، ٧٥٤، صحيح مسلم: ٤١٩

[2] صحيح البخاري: ٦٨٧، صحيح مسلم: ٤١٨، جامع الترمذي: ٩٧٨، البيهقي، دلائل النبوة: ١٩٠/٧

[3] سنن ابن ماجه: ٢٦٩٧، البيهقي، دلائل النبوة: ٧/ ٢٠١-٢٠٥

[4] سنن ابن ماجه: ١٦٢٥، مسند أحمد: ٢٦٦٥٧، مسند أبي يعلى: ٦٩٧٩

''اے اللہ! تو ہی برتر اور اعلیٰ ساتھی ہے۔'' [1]

یہی فرماتے فرماتے آنکھ کی پتلی بدل گئی اور روح پاک جنت الفردوس میں پہنچ گئی۔

مدینے شریف کی گلیوں میں شور بپا ہوگیا۔ جاں نثاروں کے رونے کی آوازیں آنے لگیں۔ مسلمانوں کی آنکھ میں دنیا اندھیر ہوگئی۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم حیران و سراسیمہ تھے۔ غم کی وجہ سے ہوش وحواس گم تھے۔ [2] حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا تو یہ حال تھا کہ انھیں یقین ہی نہ آتا تھا کہ آنحضرت ﷺ نے انتقال فرمایا۔ [3] حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کے گھر میں گئے۔ جسم اطہر کو دیکھا۔ منہ سے منہ لگایا۔ پیشانی مبارک کو بوسہ دیا۔ آنسو بہہ رہے تھے۔ کہا کہ میرے ماں باپ آپ ﷺ پر قربان ہوں! [4] پھر حضرت صدیق رضی اللہ عنہ نے مسجد میں آکر یہ تقریر فرمائی:

''لوگو! جو کوئی حضرت رسولِ اکرم ﷺ کی عبادت کرتا تھا، وہ سن لے کہ آپ ﷺ اس دُنیا سے تشریف لے گئے ہیں اور جو کوئی اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتا تھا وہ یاد رکھے کہ اللہ تعالیٰ ہمیشہ زندہ ہے۔ اس کو موت نہیں۔'' [5]

پھر یہ آیت تلاوت فرمائی:

﴿ وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ اَفَائِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْئًا وَسَيَجْزِى اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ ﴾ [6]

---

[1] صحيح البخاري:٤٤٦٣ ، صحيح مسلم٢٤٤٤

[2] البيهقي، دلائل النبوة :٧/٢٥٥

[3] صحيح البخاري :١٢٤١ـ١٢٤٢

[4] تاريخ الطبري:٣/٢٠٢

[5] صحيح البخاري :١٢٤١ـ١٢٤٢ ، ٣٦٦٨

[6] آل عمران :٣/١٤٤

''محمد (ﷺ) تو صرف (اللہ کے) پیغمبر ہیں، ان سے پہلے بھی بہت سے پیغمبر ہوگزرے ہیں۔ بھلا اگر یہ وفات پا جائیں یا قتل ہو جائیں تو تم الٹے پاؤں پھر جاؤ گے؟ (یعنی مرتد ہو جاؤ گے؟) اور جو الٹے پاؤں پھر جائے گا تو اللہ کا کچھ نقصان نہیں کر سکے گا اور اللہ شکر گزاروں کو (بڑا) ثواب دے گا۔''

یہ آیت سن کر تمام مسلمانوں کی آنکھیں کھل گئیں اور ہر مسلمان کی زبان پر یہی آیت جاری تھی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت عباس رضی اللہ عنہ اور ان کے بیٹوں اور آپ ﷺ کے خادموں نے آپ کو غسل دیا۔[1]

حضرت علی مرتضی رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کو غسل دیتے وقت یہ کہہ رہے تھے:

''میرے ماں باپ آپ ﷺ پر قربان! آپ ﷺ کی موت سے وہ چیز جاتی رہی جو کسی دوسرے کی موت سے نہ گئی تھی، یعنی نبوت۔ غیب کی خبریں اور آسمانی وحی ختم ہوگئی۔ آپ ﷺ کی موت اتنا بڑا صدمہ ہے کہ اب سب مصیبتیں ہیچ نظر آتی ہیں اور ایسا ہمہ گیر حادثہ ہے کہ سب لوگ اس غم میں برابر کے شریک ہیں۔ اس غم کا علاج نہیں اور یہ مصیبت جانے والی ہی نہیں۔ میرے ماں باپ آپ ﷺ پر قربان! پروردگار کے حضور میں ہمارا ذکر فرمائیں اور ہمیں اپنے دل سے بھول نہ جائیں۔''[2]

حضرت رسولِ اکرم ﷺ کو تین کپڑوں میں کفنایا گیا۔[3] اس کے بعد پہلے کنبے

---

[1] البیهقي، دلائل النبوة: ۷/۲٤٤، ابن سعد، الطبقات الكبرى: ۲/۲۷۷۔۲۸۱

[2] أبو نعیم، دلائل النبوة: ۲/۳۳۷، السهيلي، الروض الأنف: ٤/۲۷۲۔ نوٹ: کچھ حصہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور کچھ حصہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قول ہے۔

[3] صحيح البخاري: ۱۲۷۱، صحيح مسلم: ۹٤۱

والوں نے ، پھر مردوں نے ، پھر عورتوں نے ، پھر بچوں نے انفرادی طور پر نماز پڑھی۔[1]
حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے جس حجرہ میں آپ ﷺ نے وفات پائی وہیں آپ ﷺ کو دفن کیا گیا[2] اور یہی حجرہ آج تک روضۂ نبوی ﷺ کہلاتا ہے۔

---

[1] سنن ابن ماجه :١٦٢٨، البيهقي، دلائل النبوة :٣١١/٢ ، ابن سعد، الطبقات الكبرىٰ: ٢٨٨/٢، ابن الجوزي، الوفا بأحوال المصطفى : ٣٣١/٢ ، تاريخ الطبري :١٩٢/٣۔
[2] جامع الترمذي:١٠١٨ ، سنن ابن ماجه:١٦٢٨،ابن سعد، الطبقات الكبرىٰ :٢٩٢/٢

چھٹا باب

اِسلامی تعلیمات

حضرت رسول خدا ﷺ نے زندگی بھر اِسلام کی تبلیغ و اشاعت کی۔ اِسلام پھیلایا اور اِسلامی تعلیمات کو رواج دینے کی مقدور بھر کوشش فرمائی۔ اِسلامی تعلیمات کے کئی حصے ہیں، ان میں سے عقائد اور عبادات بنیادی اور اساسی اہمیت رکھتے ہیں:

عقائدِ اِسلام

اِسلام کے بنیادی عقائد کو اجزائے ایمان یا شرائط ایمان بھی کہتے ہیں۔ یہ بنیادی عقائد پانچ ہیں:

۱۔ اللہ تعالیٰ پر ایمان۔
۲۔ اللہ تعالیٰ کے فرشتوں پر ایمان۔
۳۔ اللہ تعالیٰ کے رسولوں پر ایمان۔
۴۔ اللہ تعالیٰ کی کتابوں پر ایمان۔
۵۔ یوم آخرت پر ایمان۔[۱]

ایمان کا مفہوم یہ ہے کہ اِسلام کے بنیادی عقائد کا زبان سے اقرار کیا جائے اور دل سے اس کی تصدیق اور عمل سے اس کی توثیق کی جائے۔[۲] زبان کا اقرار اور دل کی تصدیق انسان اور خدا کے درمیان ایک ذہنی تعلق اور قلبی رابطہ پیدا کر دیتا ہے۔ یہی تعلق اور رابطہ عقیدہ ہے اور اسی عقیدے کی مضبوطی اور یقین کا نام ایمان ہے۔

اِسلامی نظامِ حیات میں ایمان کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اس ایمان پر تمام اعمال کا

۱۔ صحيح البخاري: ٥٠، صحيح مسلم: ٩

۲۔ ابن أبي العز الحنفي، شرح العقيدة الطحاوية، ص: ٣٣٢

دارو مدار ہے۔ ایمان کے بغیر عمل بے کار ہے۔ ایمان کی صحت اعمال کی قبولیّت کی ضامن ہے۔ ایمان رحمت الٰہی اور مغفرت کا موجب ہے۔ ایمان نجات اُخروی کا باعث ہے۔ ایمان ایک صالح معاشرہ پیدا کرتا ہے۔ انھی وجوہات کی بنا پر ایمان کو نظامِ اِسلام کا بنیادی پتھر تصوّر کیا جاتا ہے۔

١۔ اللہ کو ماننا ایمان کا پہلا اور ضروری جز ہے۔ تمام اعمال کی صحت اور قبولیت ایمان باللہ پر منحصر ہے۔ اللہ تعالیٰ کے بارے میں اِسلامی عقیدہ یہ ہے کہ وہ ایک ہے۔ پاک اور بے عیب ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں۔ نہ اس کا باپ ہے نہ بیٹا۔ وہ کسی کا محتاج نہیں۔ سب اس کے محتاج ہیں۔ وہی خالق ہے۔ ساری کائنات اس کی مخلوق ہے۔ وہی سب کو روزی دیتا ہے۔ موت و حیات، صحت و بیماری، دولت مندی اور افلاس سب اسی کے اختیار میں ہے۔ صرف وہی عبادت کے لائق ہے۔ اس کے سوا اور کوئی معبود و مسجود نہیں۔[1]

٢۔ اِسلامی عقائد کی رُو سے فرشتوں پر ایمان لانا بھی ضروری ہے۔ فرشتے اللہ تعالیٰ کی نورانی مخلوق ہیں۔ وہ ہمیں نظر نہیں آتے۔ وہ پاک اور نیک ہیں۔ ہر وقت اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مصروف رہتے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے انھیں جن کاموں پر مقرر کر رکھا ہے وہ ان کو بجا لاتے رہتے ہیں۔[2]

٣۔ اللہ تعالیٰ کے رسولوں اور نبیوں پر ایمان لانا بھی ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہر قوم کی ہدایت کے لیے اپنے پیغمبر بھیجے۔ اُنھوں نے خدا کے احکام لوگوں تک پہنچائے۔ وہ نیکی، پاکبازی اور ایمان و عمل کا بہترین نمونہ تھے۔ سب سے آخری اور بزرگ نبی حضرت محمد ﷺ ہیں۔ پیغمبروں پر ایمان لا کر ان کی اطاعت اور فرماں برداری کرنا ہدایت اور نجاتِ اخروی کا موجب ہے۔ سب پیغمبروں کا ادب و احترام اور عزت و تعظیم

---

[1] الإخلاص :١١٢/١_٤ ، الحشر :٥٩/٢٢_٢٤ ، ابن حجر، فتح الباري :١/١١٧

[2] التحريم :٦٦/٦ ، ابن حجر، فتح الباري :١/١١٧

لازمی ہے۔ سب نبیوں نے توحید اور عمل صالح کی تلقین کی ہے۔ حضرت محمد ﷺ کی اطاعت کے بغیر مومن کی نجات ممکن نہیں۔[۱]

۴۔ خدا کی بھیجی ہوئی کتابوں پر ایمان لانا بھی ایک مسلمان کے لیے ضروری ہے۔ توریت، زبور اور انجیل کے بعد اللہ تعالیٰ نے آخری رسول ﷺ پر ایک آخری کتاب بصورت قرآنِ مجید نازل فرمائی۔ گزشتہ الہامی کتابوں پر ایمان کے ساتھ قرآن مجید پر ایمان وعمل بھی نہایت ضروری ہے۔[۲]

۵۔ الہامی کتابوں کو ماننے کے بعد یوم آخرت پر بھی ایمان و یقین بڑا ضروری ہے۔ اسلامی تعلیمات میں آخرت کی زندگی کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ قیامت و آخرت پر ایمان لانے کا یہ بھی مطلب ہے کہ ایک مسلمان کے نزدیک قبر کا ثواب وعذاب برحق ہے۔ نیز موت اور آخرت کا درمیانی حصہ عالم برزخ بھی برحق ہے۔ مرنے کے بعد قیامت کے دن دوبارہ جی اُٹھنا، میدان حشر میں جمع ہونا، حساب وکتاب، پھر جنت اور دوزخ سب برحق ہیں اور سب پر یقین وایمان ضروری ہے۔[۳]

عبادات

اِسلامی تعلیمات میں عقائد کے بعد عبادات کا درجہ ہے۔ عقیدے کے ساتھ عمل شروع ہوتا ہے۔ یہی عمل عبادت ہے۔ ویسے تو انسان کا ہر کام جو اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لیے کیا جائے عبادت ہے لیکن یہاں عبادت سے مراد ارکان اِسلام ہیں۔

ارکان اِسلام پانچ ہیں، یعنی عبادت کو خاص معنوں میں پانچ حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے:

۱۔ توحید ورسالت محمدی کی شہادت۔
۲۔ صلوٰۃ یا نماز پنجگانہ۔
۳۔ زکوٰۃ۔
۴۔ حج بیت اللہ۔

۱۔ النساء: ٤/٥٩۔٦٥، ابن حجر، فتح الباري: ١/١١٨
۲۔ البقرة: ٢/٤، ابن حجر، فتح الباري: ١/١١٧
۳۔ المؤمنون: ٢٣/١٠٠، البقرة: ٢/٤، ابن حجر، فتح الباري: ١/١١٨

۵۔ صیامِ رمضان یعنی ماہ رمضان کے روزے۔

ان عبادات کو آنحضرت ﷺ نے بنیادی اہمیت دی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے:

۱۔ **توحید و رسالت محمدی کی شہادت:** اس بات کا اقرار کرنا کہ اللہ کے سوا کوئی اور معبود نہیں۔ حضرت محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔

۲۔ **اقامتِ صلوٰۃ:** یعنی رات دن میں پانچوں وقت نماز کو پابندیِ وقت اور دلی خشوع و خضوع سے ادا کرنا۔

۳۔ **زکوٰۃ کی ادائیگی:** یعنی سال بھر میں ایک دفعہ اُصولِ شریعت کے مطابق اپنے مال کا مقررہ حصہ ادا کرنا۔

۴۔ **حج بیت اللہ:** یعنی صاحب توفیق مسلمان زندگی میں کم از کم ایک مرتبہ بیت اللہ شریف کا حج کرے۔

۵۔ **صیامِ رمضان:** ہر مسلمان سال بھر میں ایک مرتبہ ماہِ رمضان کے روزے رکھے۔[1]

لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ کا اقرار اور شہادت دراصل اِسلام اور خدا سے حلف وفاداری کے مترادف ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے مسلمان اس اقرار کے بعد خدا کی توحید پر مضبوطی سے جم جاتا ہے۔ اس کے بعد کوئی خوف اور ڈر اس کے دل میں جاگزیں نہیں ہوسکتا۔ پھر اس کا تعلق زمین و آسمان کے خالق اور مالک سے اُستوار ہوجاتا ہے۔ یہی توحید اِسلام کا مرکزی نقطہ ہے۔ تمام اعترافات اور تمام عبادات اس توحید کے اظہار کے لیے ہیں۔ توحید سے ملّت میں وحدتِ عقیدہ اور وحدتِ عمل پیدا ہوتی ہے۔ توحید کا فقدان شرک و کفر ہے اور شرک و کفر کے لیے آخرت میں نجات کی کوئی صورت ہی نہیں۔[2]

---

[1] صحيح البخاري:٨، صحيح مسلم:١٦ ، سنن النسائي:٥٠٠٤ ، جامع الترمذي :٢٦٠٩

[2] النساء:٤/٤٨-١١٦ ، المائدة :٥/٨٢

نماز اِسلام کا بہت اہم رُکن ہے۔ قرآن مجید میں نماز کی جتنی تاکید آئی ہے کسی اور عمل کی اتنی تاکید نہیں آئی۔[1] نماز دین کا ستون ہے۔[2] نماز ایسا ضروری فریضہ ہے کہ ایک مسلمان گھر میں ہو یا سفر میں، تندرست ہو یا بیمار، امن چین کی زندگی بسر کر رہا ہو یا میدانِ جنگ میں لڑ رہا ہو، نماز کسی حالت میں چھوٹ نہیں سکتی۔

اِسلامی نظامِ حیات میں نماز کی اہمیت اس بات سے بھی واضح ہے کہ اِسلام کے زرّیں عہد میں امامِ سیاست اور امامِ نماز ایک ہی شخص ہوتا تھا۔ جب تک آنحضرت ﷺ دنیا میں تشریف فرما رہے آپ ﷺ دینی عظمت و جلالت کے باوجود بنفسِ نفیس امامت کے فرائض انجام دیتے رہے۔ آپ ﷺ کے بعد ہر خلیفہ اور امیر المومنین نماز میں امام ہوتا تھا۔ خلفائے راشدین خود امامت کراتے تھے۔ ہر عامل (گورنر) اور والی اپنے اپنے علاقے میں نماز پڑھاتا تھا۔

نماز کی اہمیت کا اندازہ اس حقیقت سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ نماز کے لیے کتنا اہتمام کیا جاتا ہے۔ چھوٹی چھوٹی اور عظیم الشان مساجد کی تعمیر کی جاتی ہے۔ ان کی دیکھ بھال کے لیے خادم مقرر کیے جاتے ہیں۔ اذان دینے کے لیے مؤذن، نماز پڑھانے کے لیے امام متعین ہوتے ہیں۔ ہر گلی، ہر بازار، ہر آبادی، ہر شہر اور ہر گاؤں میں مسجد موجود ہے۔ مسجدوں کی آبادی اور دیکھ بھال کو ایمان کا معیار قرار دیا۔[3]

اِسلام کا تیسرا رکن زکوٰۃ ہے۔ یہ بہت بڑی مالی عبادت ہے۔ فتح مکہ کے بعد سن ۸ ہجری میں زکوٰۃ ہر مالدار صاحبِ نصاب مسلمان پر فرض ہوئی۔[4] قرآنِ مجید میں نماز اور زکوٰۃ کا حکم یکجا آیا ہے۔[5] زکوٰۃ اتنا اہم فریضہ ہے کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنے

---

[1] البقرة:۲/۳_۴۳_۸۳_۱۱۰، النساء:۴/۷۷_۱۰۳، الأنعام:۶/۷۲، الروم:۳۰/۳۱

[2] البيهقي، شعب الإيمان:۲۸۰۷

[3] التوبة:۹/۱۸، جامع الترمذي:۳۰۹۳

[4] البقرة: ۲/ ۲۶۷، صحيح البخاري: ۱۴۴۷، الموسوعة العربية الميسرة:۴/۱۴۳۷

[5] البقرة:۲/۴۳_۸۳، النساء:۴/۷۷

عہدِ خلافت میں زکوٰۃ نہ دینے والوں کے خلاف فوج بھیج کر جہاد کیا تھا۔[1]

زکوٰۃ فقیروں، محتاجوں اور مسکینوں کے ساتھ عملی ہمدردی کا بڑا ثبوت ہے۔ دولت مندوں کی دولت میں سے کچھ حصہ لے کر حاجت مندوں کو دینے سے بہت سی اجتماعی اور معاشرتی ضروریات پوری ہوتی ہیں۔

اِسلام کا چوتھا رُکن حج بیت اللہ ہے۔ حج کا مطلب یہ ہے ذوالحجّہ کے مہینے کی مقررہ تاریخوں میں خانہ کعبہ کی زیارت، طواف، قیامِ عرفات اور دیگر مذہبی عبادات اور مناسک و رسوم کو ادا کیا جائے۔[2] حج ہر اس مسلمان پر فرض ہے جو جسمانی اور مالی لحاظ سے بیت اللہ تک سفر کی طاقت رکھتا ہے۔[3] سارے عالم اِسلامی کے مسلمان حج کے موقع پر مکہ مکرمہ میں جمع ہوتے ہیں۔ حج سے اِسلام کی عالمگیر برادری کا بہت بڑا مظاہرہ ہوتا ہے۔ حج کے بعد ایک مسلمان گناہوں سے بالکل پاک صاف ہو جاتا ہے۔[4] حج انسانی معراج اور رُوحانی ارتقاء کا بہت بڑا ذریعہ ہے۔

اِسلام کا پانچواں رُکن روزہ ہے۔ رمضان کے روزے سن ۲ ہجری میں فرض ہوئے تھے۔ سال بھر میں ماہ رمضان میں روزے رکھنا ہر مسلمان پر فرض ہے۔[5] روزوں کے بے شمار اجتماعی، روحانی اور بدنی فوائد ہیں۔

---

[1] صحيح البخاري: ١٣٩٩، صحيح مسلم: ٢٠

[2] الموسوعة العربية الميسرة: ١٣١١/٣

[3] آل عمران: ٩٧/٣

[4] صحيح مسلم: ١٣٥٠، سنن ابن ماجه: ٢٨٨٩

[5] البقرة: ١٨٥/٢

ساتواں باب

ا۔ اَخلاقِ نبوی

حضرت رسولِ مقبول ﷺ نہایت مہربان، رحم دل اور ملنسار تھے۔ ہر چھوٹے بڑے سے محبت کرتے۔ نہایت سخی اور فیّاض تھے۔ ہر وقت اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتے رہتے تھے۔ بیہودہ باتوں سے آپ ﷺ کو نفرت تھی۔ آپ ﷺ بہترین رائے اور بہترین عقل کے مالک تھے۔

آپ ﷺ کی بیوی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ حضرت رسولِ خدا ﷺ کی عادت مبارک تھی کہ کسی کو بُرا بھلا نہ کہتے۔ برائی کے بدلے میں برائی نہ کرتے بلکہ معاف فرما دیتے تھے۔[1] آپ ﷺ نے اپنے ذاتی معاملے میں کبھی کسی سے انتقام نہیں لیا۔[2] کبھی کسی مسلمان پر لعنت نہیں کی۔[3] آپ ﷺ نے کسی غلام یا لونڈی یا جانور کو اپنے ہاتھ سے کبھی نہیں مارا[4] اور نہ کسی کی جائز درخواست کو رد کیا۔[5] جب آپ ﷺ گھر کے اندر تشریف لاتے تو مسکراتے ہوئے آتے۔[6] آپ ﷺ اس طرح آہستہ آہستہ باتیں کرتے کہ اگر سننے والا چاہے تو بے شک یاد رکھ لے۔[7]

انصاف کے معاملے میں نزدیک اور دُور کے لوگ سب آپ ﷺ کے لیے برابر تھے۔

---

۱ صحيح البخاري: ۱۲۲٥

۲ صحيح البخاري: ۳٥٦۰، صحيح مسلم: ۲۳۲۷

۳ سنن النسائي: ۲۰۹۷

۴ صحيح مسلم: ۲۳۲۸

۵ أحمد بن حنبل، مسند أحمد: ۲٤۹۸٥، الأصبهاني، أخلاق النبي ﷺ، ص: ٤۱

۶ الصالحي، سبل الهدى: ۱۲۱/۷

۷ أحمد بن حنبل، المسند: ۲٦۲۰۹، الأصبهاني، أخلاق النبي، ص: ۲۱۱

آپ ﷺ مسکینوں سے محبت فرمایا کرتے۔ غریبوں میں رہ کر خوش ہوتے۔ کسی فقیر کو تنگ دستی کی وجہ سے حقیر نہ سمجھتے۔ کسی بادشاہ کو بادشاہی کی وجہ سے بڑا نہ جانتے۔ اپنے پاس بیٹھنے والوں کی دلجوئی کرتے۔ بیوقوفوں کی باتوں پر صبر فرماتے۔ اپنے جوتے کو خود گانٹھ لیتے۔ اپنے کپڑے کو خود پیوند لگا لیتے تھے۔[1] اللہ تعالیٰ نے قرآنِ مجید میں آپ ﷺ کے اخلاق کا نقشہ یوں کھینچا ہے، فرمایا: ﴿ اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ﴾[2] یعنی ''اے رسول! آپ حسنِ اخلاق کے بڑے اُونچے مقام پر فائز ہیں۔''

صِدق

حضرت رسولِ اکرم ﷺ ہمیشہ سچ بولتے تھے۔ آپ ﷺ نے عمر بھر کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ لین دین، کاروبار، تجارت غرض یہ کہ ہر بات میں آپ ﷺ سچ بولا کرتے تھے۔ اسی واسطے بچپن سے ہی صادق مشہور ہو گئے تھے۔[3]

آپ ﷺ کے جانی دشمن بھی آپ ﷺ کی سچائی کا اعتراف واقرار کرتے تھے۔ ایک دن کا ذکر ہے کہ حضرت رسولِ اکرم ﷺ نے صفا پہاڑی پر کھڑے ہو کر قریش کو آواز دی۔ آپ ﷺ کی آواز سن کر قبیلے کے بڑے بڑے سردار اس پہاڑی کے نیچے آ کر جمع ہو گئے۔ پھر حضرت رسولِ اکرم ﷺ نے ان سے پوچھا: ''اگر میں تم سے یہ کہوں کہ اس پہاڑی کے پیچھے تمھارے دشمنوں کا ایک لشکر آ رہا ہے تو کیا تم اس بات کو تسلیم کر لو گے؟'' سب نے کہا: ہاں بے شک! کیوں کہ آپ ہمیشہ سچ بولتے ہیں۔[4]

ایک دفعہ ابوجہل نے حضرت رسولِ اکرم ﷺ کی سچائی اور صدق کا اعتراف کرتے ہوئے کہا:

---

[1] الأصبهاني، أخلاق النبي ﷺ، ص: ۲۱، ۳۰

[2] القلم: ۶۸/۴

[3] السيوطي، الخصائص الكبرى: ۱/۴۷، السهيلي، الروض الأنف: ۲/۱۷۱

[4] صحيح البخاري: ۴۸۰۱ ـ ۴۹۷۱

''اے محمد! میں تمھیں جھوٹا نہیں سمجھتا، لیکن تمھاری تعلیم پر میرا دل ہی نہیں ٹھہرتا۔''[1]

قیصرِ روم نے اپنے دربار میں ابوسفیان سے پوچھا کہ تمھارے ہاں جس شخص نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے کیا اس سے پہلے کبھی تم نے اس کو جھوٹ بولتے سنا؟ ابوسفیان نے کہا: نہیں، پھر شاہِ روم نے کہا کہ ایسا سچا آدمی جھوٹا دعویٰ نہیں کر سکتا۔[2]

حضرت رسولِ اکرم ﷺ نے ہمیشہ سچ بولا اور سچ بولنے کی نصیحت فرمائی۔ صدق اور سچائی کو جنتی لوگوں کی نشانی قرار دیا[3] اور فرمایا کہ جو شخص سچ بولے، امانت کی حفاظت و نگہداشت کرے، حسنِ خلق کا مالک ہو اور حلال کی روٹی کھائے، اسے کسی چیز کا ڈر نہیں۔[4]

امانت و دیانت

حضرت رسولِ اکرم ﷺ بچپن سے امانت اور دیانت کے لیے مشہور تھے۔ سب لوگ آپ ﷺ کو امین کے لقب سے پکارتے تھے۔[5] قریشِ مکہ کو آپ ﷺ کی امانت داری پر اتنا اعتماد اور بھروسہ تھا کہ وہ لوگ اپنا روپیہ پیسہ آنحضرت ﷺ کے پاس امانت رکھ جاتے تھے۔[6]

حضرت رسولِ اکرم ﷺ نہایت دیانتدار اور امین مشہور تھے۔ قریش کے آدمی آپ ﷺ کی ایمان داری کی وجہ سے اپنا مالِ تجارت اور سرمایہ مضاربت پر آپ کے سپرد کر دیتے تھے۔ اس سرمائے سے آپ ﷺ کاروبار کرتے تھے اور منافع سب کو مل جاتا تھا۔

---

1. جامع الترمذي :٣٠٦٤ ، المستدرك للحاكم :٣٢٨٣ ، قاضي عياض، الشفا بتعريف حقوق المصطفى :١٣٤/١
2. صحيح البخاري:٢٩٤١، صحيح مسلم:١٧٧٣
3. صحيح مسلم:٢٦٠٧ ، جامع الترمذي :١٩٧١
4. مسند أحمد :٦٦٥٢، المستدرك للحاكم :٧٩٤٦
5. المستدرك للحاكم:١٧٢٦ ، البيهقي ، دلائل النبوة :٥٧/٢
6. ابن هشام، السيرة النبوية :٤٨٢/١ ، البيهقي ، دلائل النبوة :٤٦٦/٢

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے آپ ﷺ کی دیانت داری، سچائی اور ایمان داری کو دیکھ کر نکاح کی درخواست کی تھی۔[1]

ایک دفعہ بہت بارش ہوئی جس کی وجہ سے کعبہ کی عمارت کو نقصان پہنچا۔ قریش مکہ نے چاہا کہ کعبہ کی عمارت پھر سے اُونچی اور مضبوط کر کے بنائی جائے۔ جب قریش کعبہ کی دیواریں اُٹھا رہے تھے تو حجرِ اسود کو اپنی جگہ رکھنے پر جھگڑا ہو گیا۔

ہر خاندان کی یہ خواہش تھی کہ ہم حجر اسود کو اس کی جگہ پر رکھیں۔ آخر یہ طے پایا کہ جو شخص اس وقت سب سے پہلے کعبہ میں آئے وہی اپنی رائے سے اس جھگڑے کا فیصلہ کر دے اور اس کا فیصلہ سب لوگوں کو ماننا پڑے گا۔ خدا کی قدرت دیکھو کہ کعبہ میں سب سے پہلے داخل ہونے والے آنحضرت ﷺ تھے۔ آپ ﷺ کو دیکھ کر سب خوش ہو گئے اور پکار اُٹھے:

"هٰذَا الْأَمِيْنُ رَضِيْنَاهُ"

"آپ ﷺ امین ہیں۔ ہمیں آپ ﷺ کا فیصلہ بخوشی منظور ہے۔"[2]

شبِ ہجرت کو قریش مکہ نے تو حضرت رسولِ اکرم ﷺ کو قتل کرنے کا فیصلہ کیا اور آپ ﷺ نے اپنے پیارے بھائی حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اس لیے پیچھے چھوڑا کہ وہ قریش کی امانتیں انھیں واپس کر کے بعد میں آ جائیں۔[3]

حضرت رسولِ اکرم ﷺ بڑے دیانتدار تھے۔ آپ ﷺ ہر بات میں سچا وعدہ فرماتے اور جو وعدہ فرماتے اس کو پورا کرتے تھے۔ آپ ﷺ کی تجارت کے ایک ساتھی عبداللہ کا بیان ہے کہ ایک دن میں نے آنحضرت ﷺ سے اس زمانے میں خرید و فروخت کا ایک معاملہ کیا، بات کچھ طے ہو چکی تھی کچھ ادھوری رہ گئی تھی۔ میں نے وعدہ کیا کہ پھر آ کر بات پوری کر لیتا ہوں، یہ کہہ کر میں چلا گیا۔ تین دن کے بعد مجھے اپنا وعدہ

[1] أبو نعيم، دلائل النبوة: ۱۱۰، البيهقي، دلائل النبوة: ۲/۶۷، ابن هشام، السيرة النبوية: ۱/۱۸۹

[2] الطبراني، المعجم الأوسط: ۲۴۴۲، المستدرك للحاكم: ۱۷۲۶، البيهقي، دلائل النبوة: ۲/۵۷، صفي الرحمن مباركبوري، الرحيق المختوم، ص: ۷۱

[3] البيهقي، دلائل النبوة: ۲/۴۶۶، ابن هشام، السيرة النبوية: ۱/۴۸۲

یاد آیا۔ فوراً پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں، آپ ﷺ اسی جگہ بیٹھے ہیں اور میرے واپس آنے کا انتظار فرما رہے ہیں۔[1]

حضرت رسولِ اکرم ﷺ فرمایا کرتے تھے کہ

''جو شخص وعدہ پورا نہیں کرتا، دیانتدار نہیں کہلا سکتا۔''[2]

نضر بن حارث قریش میں سب سے تجربہ کار شخص تھا۔ ایک دن وہ اپنے ساتھیوں سے کہنے لگا کہ ''حضرت محمد ﷺ تمھارے سامنے پل کر جوان ہوئے۔ وہ تم میں سب سے اچھے، بات میں سب سے سچے، امانت میں سب سے پکے اور امین تھے۔ اب جب ان کے بال سفید ہونے لگے اور تم کو دعوت حق دی تو تم انھیں جادوگر اور دیوانہ کہتے ہو، بخدا! وہ ساحر نہیں۔[3]

مختصر یہ کہ دوست دشمن سب حضرت رسولِ اکرم ﷺ کی سچائی، صدق اور امانت و دیانت کا اعتراف و اقرار کرتے تھے اور آپ ﷺ کو صادق اور امین کے معزز القاب سے یاد کرتے تھے۔

عدل ومساوات

حضرت رسولِ اکرم ﷺ اپنے پرائے، امیر غریب سب سے عدل کرتے اور ایک جیسا برتاؤ کرتے تھے۔ آپ ﷺ ہمیشہ مظلوموں کی فریاد سنتے، ان سے انصاف کرتے اور ان کا حق دلاتے تھے۔ دشمنوں کو بھی آپ ﷺ کے عدل و انصاف پر پورا اعتماد تھا۔ جب تک حضرت رسولِ اکرم ﷺ مکے میں تشریف فرما رہے اہلِ مکہ اپنے جھگڑے قضیے آپ ﷺ کے

---

[1] سنن أبي داود:٤٩٩٦

[2] مسند أحمد:١٢٣٨٣، مسند أبي يعلى:٢٨٦٣، صحيح ابن حبان:١/٤٢٣، ١٩٤

[3] الذهبي، تاريخ الإسلام:١/٩٣، البيهقي، دلائل النبوة:٢/٢٠١، السيوطي، الخصائص الكبرى:١/١١٤، محمد الخضري، نور اليقين، ص:٢٦، قاضي عياض، الشفا بتعريف حقوق المصطفى:١/١٣٥

پاس فیصلے کے لیے لے جاتے تھے۔[1] مدینے میں تشریف لانے کے بعد یہودی اور دوسرے مخالفین بھی اپنے مقدمات اور جھگڑوں میں آنحضرت ﷺ ہی کا فیصلہ تسلیم کرتے تھے۔[2]

حضرت رسولِ اکرم ﷺ کے عدل و مساوات کا یہ حال تھا کہ ایک مرتبہ قرض خواہ تقاضے کے لیے آیا اور سخت سُست بکنے لگا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اسے مارنے چلے۔ آپ ﷺ نے روکا اور فرمایا:

> ''عمر! تمھارے لیے یہ زیادہ مناسب تھا کہ مجھے ادا کرنے کی نصیحت کرتے اور اُسے صبر کی۔''[3]

ایک دفعہ بنوثَعلبہ کے کچھ لوگ مدینے میں آئے۔ ان کو دیکھ کر ایک انصاری نے کہا: یارسول اللہ! ان کے باپ دادا نے ہمارے خاندان کے ایک شخص کو قتل کر دیا تھا، اب اس کے بدلے میں ان کا ایک آدمی قتل کرا دیجیے۔ حضرت رسولِ اکرم ﷺ نے فرمایا: ''یہ نہیں ہوسکتا۔ باپ کا بدلہ بیٹے سے نہیں لیا جا سکتا۔''[4]

ایک مرتبہ ایک عورت نے چوری کی۔ قریش اپنی عزّت کے خیال سے چاہتے تھے کہ اسے سزا نہ ہو اور بات دَب جائے۔ چنانچہ قریش نے سفارش بھی کرائی۔ اس پر حضرت رسولِ اکرم ﷺ ناراض ہو کر فرمانے لگے:

> ''بنی اسرائیل اسی وجہ سے تباہ ہوئے کہ وہ غریبوں کو سزا دیتے اور امیروں کو چھوڑ دیتے تھے۔ خدا کی قسم! اگر میری بیٹی فاطمہ رضی اللہ عنہا بھی چوری کرتی تو میں اس کا بھی ہاتھ کٹوا دیتا۔''[5]

---

[1] الطبراني، المعجم الأوسط: ٢٤٤٢، المستدرك للحاكم: ١٧٢٦، ابن كثير، السيرة النبوية: ٢٥٧/١

[2] صحيح البخاري: ٣٦٣٥، صحيح مسلم: ١٦٩٩

[3] المستدرك للحاكم: ٢٢٨٤، البيهقي، السنن الكبرى: ١١٢٨٤

[4] سنن الدارقطني: ١٨٦، مسند أحمد: ١٦٦١٣، ٢٣٢٠٢

[5] صحيح البخاري: ٣٤٧٥، صحيح مسلم: ١٦٨٨، سنن النسائي: ٤٩٠٢

ایک دفعہ ایک مسلمان اور ایک یہودی میں کسی بات پر جھگڑا ہو گیا۔ وہ دونوں فیصلے کے لیے حضرت رسولِ اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ ﷺ نے دونوں کی باتیں سن کر فیصلہ یہودی کے حق میں کر دیا۔[1]

آنحضرت ﷺ ہمیشہ سب انسانوں کو برابر سمجھتے تھے۔ امیر اور غریب، گورے اور کالے، عربی اور عجمی میں کوئی فرق نہ کرتے تھے۔ مجرم کو اس کے جرم کی سزا دیتے خواہ وہ امیر ہو یا غریب، عربی ہو یا عجمی، مسلمان ہو یا کافر۔ آپ ﷺ ہمیشہ تاکید فرماتے تھے کہ سچی گواہی دو۔

آخری حج کے موقع پر آپ ﷺ نے اس بات پر بڑی تاکید فرمائی کہ سب مسلمان آپس میں بھائی بھائی اور برابر ہیں۔[2]

رحم و کرم

حضرت رسولِ اکرم ﷺ بڑے رحم دل تھے۔ آپ ﷺ نے اپنے ذاتی معاملے میں کبھی کسی سے انتقام نہیں لیا۔ قریشِ مکہ نے آنحضرت ﷺ کو طرح طرح کی ایذائیں دیں اور دُکھ پہنچائے۔[3] مقاطعہ کر کے دانہ پانی بند کر دیا۔ آپ ﷺ شعب ابی طالب میں تین برس تک محصور رہے۔[4]

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا اور ابو طالب کی وفات کے بعد کفار بے مروتی اور کمینگی کے اوچھے ہتھیاروں پر اُتر آئے۔[5] آپ ﷺ کے قتل کی سازشیں کرنے لگے اور آپ ﷺ کو وطن چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔[6] ان سب تکلیفوں کے باوجود آپ ﷺ نے کبھی کسی سے بدلہ نہیں

---

[1] البغوي، التفسير: ۱/٤٤٦

[2] البيهقي، شعب الإيمان: ٥١٣٧

[3] ابن الجوزي، الوفا بأحوال المصطفى: ۱/۱٤٩

[4] ابن الجوزي، الوفا بأحوال المصطفى: ۱/۱٥٧

[5] ابن كثير، البداية والنهاية: ۳/۳٦۱، ۳٧۳

[6] الأنفال: ۸/۳۰، ابن الجوزي، الوفا بأحوال المصطفى: ۱/۱٦٧

لیا، بلکہ جب انتقام کا موقع آیا تو آپ ﷺ نے رحم وکرم سے کام کیا اور بدترین دشمنوں اور سخت مخالفوں کو بھی معاف کر دیا۔[1]

آپ ﷺ کا رحم وکرم سب کے لیے عام تھا۔ آپ ﷺ دوست دشمن سب پر رحم وکرم فرماتے تھے۔ آنحضرت ﷺ ساری دنیا کے لیے رحمت بن کر آئے تھے۔[2] آپ ﷺ نے عمر بھر نہ کسی کو ستایا، نہ دکھ دیا۔ وہ ہندہ جس نے جنگِ اُحد میں آپ ﷺ کے پیارے چچا حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کا کلیجہ چبایا تھا، جب آپ ﷺ کے سامنے حاضر ہوئی تو آپ ﷺ نے اس پر رحم کیا اور اسے معاف فرما دیا۔[3] اسی طرح حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے قاتل وحشی کو بھی معاف دے دی۔[4]

وہ ابوسفیان جس نے فوج لے کر مدینے پر چڑھائی کی تھی، اس کو صرف معاف ہی نہ کیا بلکہ اس کے لیے رحم وکرم کا وسیع دامن پھیلا دیا۔ اس کی عزت افزائی اور دل جوئی فرمائی۔ فتح مکہ کے دن اس کے گھر کو بہت بڑا شرف دیا۔ فرمایا:

> ”جو ابوسفیان کے گھر داخل ہوگا وہ امن پائے گا۔“ مزید فرمایا: ”جو شخص کعبہ میں داخل ہو جائے گا وہ بھی امن میں رہے گا۔“[5]

معاملہ یہیں ختم نہ ہوا بلکہ آنحضرت ﷺ نے اتنے بڑے رحم وکرم کا ثبوت دیا کہ اس کی مثال نہیں ملتی۔ آپ ﷺ نے ابوسفیان، اس کے بیٹوں اور قریش کے دوسرے سرداروں کو ہَوازِن کے مالِ غنیمت میں سے سب سے زیادہ حصہ دیا۔[6]

---

[1] ابن الجوزي، الوفا بأحوال المصطفى: ۲/۲۷، ۳۴

[2] الأنبياء: ۲۱/۱۰۷

[3] صحيح البخاري: ۳۸۲۵، ابن الأثير، أسد الغابة: ۵/۴۱۶

[4] السهيلي، الروض الأنف: ۳/۱۵۲-۱۶۲-۱۶۹، ابن عبدالبر، الاستيعاب: ۴/۱۲۵، ابن الأثير، أسد الغابة: ۴/۳۰۷-۳۰۹

[5] صحيح مسلم: ۱۷۸۰، سنن أبي داود: ۳۰۲۱-۳۰۲۲

[6] البيهقي، دلائل النبوة: ۵/۱۷۸-۱۸۲، ابن الجوزي، الوفا بأحوال المصطفى: ۲/۲۴۶

آپ ﷺ کے رحم وکرم کا یہ حال تھا کہ فرمایا کرتے :

''اگر کوئی شخص مقروض مرجائے اور مال باقی نہ چھوڑے تو ہم اس کا قرض ادا کریں گے۔''[۱]

آنحضرت ﷺ غریبوں ومسکینوں سے بہت رحم وکرم سے پیش آتے تھے۔ آپ ﷺ اس بات کو پسند فرماتے کہ غریبوں اور مسکینوں کے پاس بیٹھیں۔[۲]

ایک دن آنحضرت ﷺ نے ایک کالے رنگ کے آدمی کا ذکر فرمایا اور پوچھا کہ ''اسے کیا ہوا؟ کئی دنوں سے وہ نظر نہیں آیا۔'' صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کہ وہ وفات پا گیا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''تم نے مجھے خبر کیوں نہیں کی؟'' صحابہ رضی اللہ عنہم نے حقارت آمیز لہجہ میں عرض کیا کہ وہ تو یوں ہی معمولی سا آدمی تھا، مگر آپ ﷺ کے رحم وکرم نے اس بات کو گوارا نہ کیا۔ آپ ﷺ اس کی قبر پر تشریف لے گئے اور اس کے لیے دعائے مغفرت کی۔[۳]

حدیبیہ کے میدان میں ایک دن آنحضرت ﷺ مسلمانوں کے ساتھ صبح کی نماز پڑھ رہے تھے۔ دشمن کے ستر آدمی چپکے سے آئے تا کہ مسلمانوں کو نماز پڑھتے ہوئے شہید کر دیں۔ یہ سب آدمی گرفتار کر لیے گئے۔ حضرت رسولِ اکرم ﷺ نے ان پر رحم وکرم فرمایا اور سب کو کسی فدیہ یا سزا کے بغیر چھوڑ دیا۔[۴]

آپ ﷺ فرمایا کرتے تھے کہ ''جو شخص رحم نہیں کرتا، اس پر رحم نہیں کیا جائے گا۔''[۵]

---

[۱] صحيح البخاري: ٥٣٧١، صحيح مسلم: ١٦١٩، جامع الترمذي: ٢٠٩٠، مسند أحمد: ٩٨٤٨، صحيح ابن حبان: ٣٠٦٢ـ٣٠٦٤

[۲] جامع الترمذي: ٢٣٥٢، سنن ابن ماجه: ٤١٢٦

[۳] صحيح البخاري: ٤٥٨ـ ٤٦٠، ١٣٣٧، سنن ابن ماجه: ٣٢٠٣

[۴] صحيح مسلم: ١٨٠٧، محمد حسين هيكل، حياة محمد ﷺ، ص: ٢٣٥، تاريخ الطبري: ١٢٠/٢، الذهبي، تاريخ الإسلام: ٣٨٧/٢

[۵] صحيح البخاري: ٦٠١٣، صحيح مسلم: ٢٣١٩

ایک دن حضرت رسولِ اکرم ﷺ ایک درخت کے نیچے سو گئے۔ آپ ﷺ نے اپنی تلوار درخت سے لٹکا دی۔ ایک کافر آیا اور تلوار نکال کر آپ ﷺ کو جگایا، پھر کہنے لگا کہ بتاؤ اب میرے ہاتھ سے آپ کو کون بچائے گا؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ!'' یہ سن کر تلوار اس کے ہاتھ سے گر پڑی۔ پھر آنحضرت ﷺ نے تلوار اُٹھا کر فرمایا کہ ''بتا اب تجھے کون بچائے گا؟'' وہ حیران ہو گیا۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا: ''جاؤ تجھے معاف کیا، میں بدلہ نہیں لیا کرتا۔''[1]

ایک دن ایک بدو آیا۔ اس نے حضرت رسولِ اکرم ﷺ کی چادر کو اتنے زور سے کھینچا کہ آپ ﷺ کی گردن پر نشان پڑ گیا۔ پھر بدو بولا: یا محمد! خدا کا یہ مال جو آپ کے پاس ہے، اس میں سے ایک بارِ شتر مجھے بھی دلاؤ۔ آپ ﷺ نے ذرا خاموشی کے بعد فرمایا کہ مال بے شک اللہ کا ہے۔ پھر فرمایا کہ اسے ایک اونٹ پر کھجوریں اور ایک پر جو لاد دو۔[2]

آنحضرت ﷺ کی عادت مبارکہ تھی کہ آپ ﷺ بچوں اور جانوروں پر بھی رحم اور شفقت و کرم فرمایا کرتے تھے۔[3]

شجاعت

حضرت رسولِ اکرم ﷺ بچپن سے ہی بڑے بہادر اور دلیر تھے۔ بڑے سے بڑے بہادر شخص کا رعب بھی نہ مانتے تھے۔ اتنے نڈر اور بے باک تھے کہ قریش کے معبودوں اور بتوں کو خاطر میں نہ لاتے۔ بچپن کا واقعہ ہے کہ ایک دن کسی شخص نے لات اور عزّیٰ بتوں کا واسطہ دے کر کچھ مانگا۔ شرم و حیا کا پیکر ہونے کے باوجود آپ ﷺ نے فرمایا:

---

[1] صحيح البخاري: ۲۹۱۰، ۲۹۱۳، ۴۱۳۵، ۴۱۳۶، صحيح مسلم: ۸۴۳

[2] صحيح البخاري: ۳۱۴۹، ۵۸۰۹، صحيح مسلم: ۱۰۵۷

[3] صحيح البخاري: ۳۰۱۹، صحيح مسلم: ۲۳۱۵، سنن أبي داود: ۲۰۶۲

''مجھے ان بتوں سے بڑی نفرت ہے۔ میرے سامنے ان کا نام نہ لیا کرو۔''[1]

کتنی بہادری اور جرأت ہے کہ ایک چھوٹا بچہ اپنی قوم کے بتوں کے متعلق اتنی بے باکی سے نفرت کا اظہار کرتا ہے اور کسی کی پروا نہیں کرتا۔ آخر کیوں نہ ہوتا یہ کوئی معمولی بچہ نہ تھا۔ یہ مبارک بچہ نبیوں کا سردار بننے والا تھا۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ آنحضرت ﷺ کی عمر سولہ سترہ برس کی تھی۔ آپ ﷺ اپنے چچا کے ساتھ یمن گئے۔ قافلہ ابھی راستے میں تھا تو کیا دیکھتے ہیں کہ ایک وادی میں ایک بڑا منہ زور اونٹ ایسا بدکا کہ رسی توڑ کر بھاگ نکلا۔ لوگ ابھی سوچ ہی رہے تھے کہ کیا کریں۔ آنحضرت ﷺ اس منہ زور اور بدکے ہوئے اونٹ کی طرف لپکے اور بے خوف ہو کر اس کو نکیل سے پکڑ کر لائے۔[2]

آنحضرت ﷺ بڑے دلیر تھے۔ آپ ﷺ کی ہمت اور جرأت بے مثال تھی۔ ایک مرتبہ آپ ﷺ قافلے کے ساتھ جا رہے تھے، راہ میں ایک وادی تھی۔ ہر طرف پانی ہی پانی نظر آتا تھا۔ قافلے والے پانی کا طوفان دیکھ کر رُک گئے۔ حضرت رسولِ اکرم ﷺ آگے بڑھے اور فرمایا: ''میرے پیچھے پیچھے چلے آؤ۔''[3]

ہجرت کے بعد آنحضرت ﷺ مدینے میں تشریف فرما تھے کہ ایک رات مدینے شریف کے لوگ ڈر گئے۔ لوگ گھبرا کر باہر نکلے کہ دیکھیں کیا معاملہ ہے۔ اتنے میں کیا دیکھتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ تلوار لٹکائے گھوڑے پر سوار واپس تشریف لا رہے ہیں۔ لوگوں کو دیکھ کر آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''میں نے شور سنا تو حالات معلوم کرنے کے لیے فوراً باہر نکل گیا۔ آپ لوگ کوئی فکر نہ کریں۔ یہ ایک قافلہ ہے جو شہر سے باہر اُترا ہے اور کوئی بات نہیں۔''[4]

---

[1] ابن الجوزي، الوفا بأحوال المصطفى: ١/١٠٩، ١١٣، قاضي عياض، الشفا: ٢/١١٤

[2] ابن كثير، البداية والنهاية: ٣/٦٠، ابن ناصر الدين الدمشقي، جامع الآثار: ٢/١١٠٤

[3] الصالحي، سبل الهدى: ٢/١٣٩، ابن كثير، البداية والنهاية: ٣/٦٠

[4] صحيح البخاري: ٢٦٢٧، ٢٨٦٦، ٢٨٦٧، سنن ابن ماجه: ٢٧٧٢

غزوات نبوی آپ ﷺ کی بے مثال بہادری اور شجاعت کے گواہ ہیں۔ جفاکشی اور ہمت و جرأت دیکھیے کہ تمام جنگیں اور غزوات پچپن برس کی عمر کے بعد پیش آئے۔ رات بھر عبادت کرتے ہیں، سارا دن روزہ رکھتے ہیں، پھر فکر تبلیغ، فکر ملت، فکر بنی نوع انسان، ان حالات میں عمروسن کو ملحوظ رکھتے ہوئے آپ کی بہادری کی داد دیجیے۔ غزوۂ بدر کو لیجیے کہ جب دشمن سامنے آکر صف آرا ہو گیا تو حضرت رسولِ اکرم ﷺ کی بہادری اور شجاعت دیکھنے کے لائق تھی۔ آپ ﷺ اپنی صفوں میں چکر لگا رہے تھے۔ مسلمان مجاہدوں کو ایمان و عمل صالح کی تلقین کے ساتھ جہاد فی سبیل اللہ کی برکات بتا رہے تھے۔ اپنے افسروں اور سپاہیوں کو بہادری پر اُکساتے جاتے تھے اور ایک تجربہ کار اور ماہر جنگ سپہ سالار کی طرح بتا رہے تھے کہ دشمن کے بڑے بڑے سردار اور سالار کہاں کھڑے ہوں گے اور قتل ہو کر کہاں کہاں گریں گے۔[1]

غزوۂ اُحد اور غزوۂ حُنین میں آپ ﷺ نے جس بہادری، استقامت اور شجاعت کا ثبوت دیا اس کی مثال تاریخ میں ملنی بڑی مشکل ہے۔ آپ ﷺ اکیلے دشمن کا مقابلہ کرتے تھے اور میدانِ جنگ چھوڑ جانے والے سپاہیوں کو واپس بلا کر از سرِ نو اُن میں بہادری اور جرأت کی رُوح پھونکتے تھے اور پھر اس بہادری سے لڑے کہ دشمن کو بھاگنے کے سوا کوئی اور چارۂ کار نظر نہ آیا۔[2]

رواداری

حضرت رسولِ اکرم ﷺ بڑے روادار تھے۔ اپنے تو اپنے غیروں کا بھی آپ ﷺ لحاظ کرتے تھے۔ اگر کوئی دشمن بھی آجاتا تو اس سے بڑی اچھی طرح ملتے اور اس کی ضرورت پوری کر دیتے تھے۔ تکلیف کے وقت دشمن کی مدد کرنے سے بھی دریغ نہ فرماتے تھے۔ ایک دفعہ مکے میں اتنا سخت قحط پڑا کہ لوگ مردار اور ہڈیاں بھی کھانے لگے۔ ابوسفیان دشمنی کے

---

1. صحيح مسلم:١٧٧٩، أحمد باوزير، مرويات غزوة بدر:١٧٤ـ١٨٠
2. صحيح البخاري:٢٨٦٤، صحيح مسلم:١٧٧٥، ١٧٨٩

باوجود آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آیا اور عرض کیا کہ اے محمد! آپ تو لوگوں کو قریبی رشتہ داروں سے نیک سلوک کی تعلیم دیتے ہیں۔ دیکھیے آپ کی قوم ہلاک ہو رہی ہے، خدا سے دعا کیجیے۔ یہ سن کر آنحضرت ﷺ نے دعا فرمائی اور خوب بارش ہوئی۔[1]

مکے میں ایک عورت رہتی تھی۔ جب حضرت رسولِ اکرم ﷺ گلی سے گزرتے تو وہ عورت آپ ﷺ پر کوڑا کرکٹ پھینک دیا کرتی تھی، ایک دفعہ وہ بیمار ہوگئی تو آپ ﷺ اس کا حال پوچھنے کے لیے اس کے گھر تشریف لے گئے۔

مکے کے لوگوں کے لیے غلّہ نجد سے آیا کرتا تھا۔ ایک صحابی ثمامہ رضی اللہ عنہ نے یہ غلہ اس لیے بند کر دیا کہ مکے والے حضرت رسولِ اکرم ﷺ کے دشمن ہیں۔ جب آپ ﷺ کو اس کا علم ہوا تو آپ ﷺ نے اسے ایسا کرنے سے منع کر دیا۔[2] کتنی بے نظیر رواداری ہے کہ قریش تو آپ ﷺ کی جان کے دشمن ہیں اور آپ ﷺ کو یہ بھی گوارا نہیں کہ وہ لوگ بھوکے رہیں۔

ایک دفعہ نجران کے عیسائیوں کا وفد حضرت رسولِ اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ان لوگوں نے اپنے طریقے کے مطابق عبادت کرنے کی خواہش ظاہر کی تو آپ ﷺ نے انھیں اجازت دے دی کہ وہ مسجدِ نبوی میں عبادت کر لیں۔[3]

ایک مرتبہ ایک بدّو حضرت رسولِ اکرم ﷺ کی خدمت میں آیا۔ آپ ﷺ مسجد میں تشریف فرما تھے۔ بدو کو پیشاب آیا تو وہ مسجد میں پیشاب کرنے لگا۔ لوگ اسے مارنے کے لیے دوڑے۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

''جانے دو، اسے کچھ نہ کہو، پانی کا ایک ڈول لا کر بہادو۔''[4]

---

1. صحيح البخاري: ٤٨٢٤، صحيح مسلم: ٢٧٩٨، البيهقي، السنن الكبرى: ٦٤٢٨
2. صحيح البخاري: ٤٣٧٢، صحيح مسلم: ١٧٦٤، البيهقي، السنن الكبرى: ١٨٠٣٠ـ ١٨٠٣١
3. ابن هشام، السيرة النبوية: ٥٧٤/١، ابن سيد الناس، عيون الأثر: ٢٢٠/١، السهيلي، الروض الأنف: ٣/٣
4. صحيح البخاري: ٢٢٠، ٦١٢٨

آنحضرت ﷺ اپنے دشمنوں اور مخالفوں پر غلبہ پانے کے بعد صرف معاف ہی نہ فرما دیتے بلکہ بعض اوقات ان سے بڑا لطف و کرم اور مہربانی فرماتے تھے، ان کو خوب کھلاتے، ان کی آسائش کا خیال رکھتے اور انعام بھی دیتے تھے۔

حضرت رسولِ اکرم ﷺ کو سب سے پہلے جنگِ بدر میں قیدی ہاتھ لگے تھے، یہ اہلِ مکہ تھے۔ ان سے بڑھ کر اور کوئی دشمن نہ تھا۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے قتل کر دینے کا مشورہ دیا لیکن اس کے باوجود رحمت عالم ﷺ نے ان سے بڑا اچھا سلوک کیا۔ مہمانوں کی طرح ان کی خاطر مدارات اور آسائش و آرام کا خیال رکھا۔[1]

حدیبیہ کے مقام پر ستر حملہ آوروں کو بغیر کسی جرمانہ کے آزاد کر دیا۔[2]

جنگِ حنین میں چھ ہزار قیدی ہاتھ لگے۔ ان میں مرد بھی تھے اور عورتیں بھی۔ ان قیدیوں کو کسی شرط اور جرمانہ کے بغیر آزاد کر دیا اور بعض سے اتنی رواداری اور حسن سلوک کیا کہ ان کا معاوضہ اپنے پاس سے ادا کر کے رہائی دلائی اور اکثر قیدیوں کو خلعت اور انعام دے کر رخصت کیا۔[3]

مالک بن عوف جنگِ حنین میں دشمنوں کا سپہ سالار تھا۔ آنحضرت ﷺ نے اسے بھی معاف فرما دیا۔ اس کے بال بچے اور اُونٹ وغیرہ اسے واپس کر دینے کے علاوہ ایک سو اونٹنیاں اپنے پاس سے عطا فرمائیں۔[4] اس قسم کی رواداری اور حسن سلوک کی مثال تاریخ میں کہیں نہیں مل سکتی۔

سادہ زندگی

حضرت رسولِ اکرم ﷺ بڑی سادہ زندگی بسر کرتے تھے۔ اُٹھنے بیٹھنے، پہننے اوڑھنے، کھانے پینے کی چیزوں میں کوئی تکلف نہ تھا۔ جو کھانا سامنے آتا کھا لیتے، کپڑا جو مل جاتا

۱۔ ابن الجوزي، الوفا بأحوال المصطفى:۲/۲۲۹، ابن سعد، الطبقات الكبرى:۲/۲۲

۲۔ محمد حسين هيكل، حياة محمد ﷺ، ص:۲۳۵

۳۔ صحيح البخاري:۴۳۱۸-۴۳۱۹، البيهقي، دلائل النبوة:۵/۱۹۵، ابن الأثير، الكامل:۲/۲۶۹

۴۔ البيهقي، دلائل النبوة:۵/۱۷۸

پہن لیتے ، زمین پر، چٹائی پر، فرش پر جہاں جگہ مل جاتی بیٹھ جاتے۔ لباس میں نمائش کو ناپسند فرماتے تھے۔ سامان کی آرائش سے نفرت تھی۔

آنحضرت ﷺ مویشی کو چارہ خود ڈال دیتے۔ اونٹ کو اپنے ہاتھ سے باندھتے۔ گھر میں صفائی کر لیتے، بکری دوہ لیتے ، خادم کے ساتھ بیٹھ کر کھا لیتے ، خادم کو اس کے کام کاج میں مدد دیتے ، خود جا کر بازار سے سودا سلف خرید لیتے ، خود اسے اُٹھا لاتے تھے۔ ہر چھوٹے بڑے کو سلام پہلے کر دیا کرتے ، رات دن کا لباس ایک ہی رکھتے ، ہر امیر غریب کی دعوت قبول فرما لیتے تھے۔ جوتا پھٹ جاتا تو خود گانٹھ لیتے اور کپڑے کو پیوند لگا لیتے تھے۔[1]

آپ ﷺ کی بیوی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان فرماتی ہیں کہ برابر ایک ایک مہینہ ہمارے چولھے میں آگ روشن نہ ہوتی تھی۔ آنحضرت ﷺ کا کنبہ پانی اور کھجور پر گزران کرتا۔[2]

یہ حالت ماہِ رمضان کے علاوہ تھی۔ حضرت رسولِ اکرم ﷺ نے مدینے تشریف لانے کے بعد مسلسل تین دن تک گیہوں کی روٹی کبھی نہیں کھائی تھی۔[3]

آنحضرت ﷺ نے ہاتھ سے کام کرنے کو کبھی عار نہیں سمجھا اور نہ کبھی محنت مشقت سے جی چرایا۔ جب خانہ کعبہ کی تعمیر ہو رہی تھی تو آپ ﷺ پتھر اُٹھا اُٹھا کر معماروں کے پاس لاتے تھے۔[4] مسجد نبوی کی تعمیر کے وقت بھی خود کام کرتے رہے۔[5] جنگِ خندق کے موقع پر مدینے کے اردگرد خندق کھودنے میں ہاتھ بٹایا اور دستِ مبارک سے بڑے بڑے پتھر توڑے۔[6]

---

[1] الصالحي، سبل الهدٰى: ۷/۳۱-۴۱

[2] صحيح مسلم: ۲۹۷۲، جامع الترمذي: ۲۴۷۱

[3] صحيح البخاري: ۵۴۱۶، صحيح مسلم: ۲۹۷۰

[4] ابن الجوزي، الوفا بأحوال المصطفٰى: ۱/۱۱۸

[5] صحيح البخاري: ۳۹۳۲، ابن الجوزي، الوفا بأحوال المصطفٰى: ۱/۲۰۰

[6] صحيح البخاري: ۴۱۰۱

آپ ﷺ کی عادت مبارک تھی کہ بیوہ یا مسکین کے ساتھ چل کر اس کا کام بخوشی کر دیتے تھے۔[1] حضرت رسولِ اکرم ﷺ اتنی سادہ زندگی بسر کرتے تھے کہ باہر سے آنے والوں کو آپ ﷺ کو پہچاننا مشکل ہوتا تھا۔[2]

ایک دفعہ حضرت رسولِ اکرم ﷺ اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم کے ساتھ سفر میں تھے کہ ساتھیوں نے کھانا تیار کرنے کا ارادہ کیا۔ سب نے تھوڑا بہت کام کرنے کا ذمہ لیا۔ حضرت رسولِ اکرم ﷺ بھی ہاتھ بٹانے کے لیے اُٹھے اور جلانے کے لیے لکڑیاں جمع کرنے لگے۔[3] ایک دفعہ کسی نے ایک خوبصورت زرکار جوڑا آپ ﷺ کی خدمت میں بھیجا۔ آپ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو عنایت فرمایا، وہ پہن کر آپ ﷺ کی خدمت میں آئے۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

''میں نے تو اس لیے بھیجا تھا کہ پھاڑ کر زنانی چادریں بنالی جائیں۔''[4]

ایک مرتبہ کسی نے کمخواب کی قبا بھیجی۔ آپ ﷺ نے پہن کر اتار دی اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس بھیج دی تاکہ اس کو فروخت کر دیا جائے۔[5]

۹ ھ میں جب کہ یمن سے شام تک اِسلام کا ڈنکا بج چکا تھا اور اِسلام کی حکومت قائم ہو چکی تھی۔ آنحضرت ﷺ جمہوریت کے صدر بھی تھے اور سپہ سالارِ اعظم بھی۔ اس وقت بھی آپ ﷺ کے گھر میں صرف ایک کُھرّی چارپائی اور ایک چمڑے کا سوکھا ہوا مشکیزہ تھا۔[6]

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ جب آنحضرت ﷺ نے وفات پائی تو تھوڑے

---

[1] صحيح مسلم:٢٣٢٦، جامع الترمذي:٢٩٥٣

[2] صحيح البخاري:٦٠٣٩

[3] المقريزي، إمتاع الأسماع:١٨٨/٢، الصالحي، سبل الهدى:١٣/٧

[4] صحيح مسلم:٢٠٦٨، ٢٠٧١

[5] صحيح مسلم:٢٠٧٠، مسند أحمد:١٥١٠٧، صحيح ابن خزيمة:٥٤٢٨

[6] المقريزي، إمتاع الأسماع:١٠٩/٧، الصالحي، سبل الهدى:٣٦١/٧

سے جَو کے سوا گھر میں کچھ نہ تھا۔[1] چراغ کے لیے تیل ایک ہمسایہ سے مانگ کر لیا تھا۔[2]
حضرت رسولِ اکرم ﷺ کو سادہ زندگی سے اتنی محبت تھی کہ آپ ﷺ دعا فرمایا کرتے تھے کہ

''اے اللہ! آلِ محمد کو صرف اتنا دے، جتنا پیٹ میں ڈال لیں۔''[3]

ایک دفعہ چٹائی پر لیٹے آرام فرما رہے تھے۔ جب اُٹھے تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے دیکھا کہ بدن مبارک پر چٹائی کے نشان پڑ گئے ہیں۔ عرض کی کہ یا رسول اللہ! اجازت ہو تو آپ کے لیے کوئی گدا بنوا لائیں۔ فرمایا:

''مجھ کو دنیا سے صرف اتنا تعلق ہے جتنا اس سوار کو جو تھوڑی دیر کے لیے راہ میں کسی درخت کے سایہ میں بیٹھ جائے۔ پھر وہ اس کو چھوڑ کر آگے بڑھ جاتا ہے۔''[4]

سپہ سالاری

یہ بات ہمیشہ یاد رکھنی چاہیے کہ دینِ اِسلام جنگ و جدال کا مذہب نہیں، بلکہ صلح و سلامتی اور امن و امان کا مذہب ہے۔ حضرت رسولِ اکرم ﷺ رحمت کا پیغام لے کر آئے تھے۔ لڑائی اور جنگ کی خاطر تشریف نہ لائے تھے۔ اِسلام ایک نیا دینی نظام لایا جس نے پرانے اور باطل نظام کو منسوخ کر دیا۔ اِسلام کی جنگیں مجبوری کی بنا پر لڑی گئیں۔ حضرت رسولِ اکرم ﷺ نے تنگ آ کر جنگ کی۔ جب آپ ﷺ کے لیے کوئی چارہ کار نہ رہا تو دشمنوں کی شرارتوں کو روکنے کے لیے آپ ﷺ بھی میدانِ کارزار میں اُترنے پر مجبور ہو گئے۔

---

[1] صحيح البخاري: ٣٠٩٧
[2] ابن ناصر الدين، جامع الآثار: ٥/ ٢٦٥٠، الصالحي، سبل الهدٰى: ١٢/ ٢٥٠
[3] صحيح البخاري: ٦٤٦٠، صحيح مسلم: ١٠٥٥
[4] مسند أحمد: ٢٧٤٥، صحيح ابن حبان: ٦٣٥٢، البيهقي، شعب الإيمان: ١٤٥٠

ان غزوات اور دینی جنگوں نے ثابت کر دیا کہ آنحضرت ﷺ کو فنونِ جنگ میں بڑی مہارت حاصل تھی اور آپ ﷺ لشکر کشی، فوجی تربیت، عسکری نظام اور میدانِ جنگ میں فوج کی قیادت اور سالاری کے اُصولوں سے خوب واقف تھے۔

حضرت رسولِ اکرم ﷺ کی یہ عادت تھی کہ جب کسی کام کا ارادہ کرتے یا کوئی اہم معاملہ درپیش ہوتا تو آپ ﷺ اپنے لشکر کے چند تجربہ کار سپاہیوں اور خاص افراد کو بلا کر مشورہ کرتے۔ مختلف خیالات اور تجویزوں کو اچھی طرح جانچتے اور جب معاملہ طے پا جاتا تو پھر بلا خوف وخطر کود پڑتے اور مشکلات سے بالکل نہ گھبراتے تھے۔[1]

آنحضرت ﷺ ہمیشہ اپنی ذات سے بے نیاز ہو کر میدانِ جنگ میں فوج کی رہنمائی فرماتے۔ آپ ﷺ ہمیشہ اپنی جان پر کھیل جانے کے لیے تیار نظر آتے۔ آپ ﷺ کا یہ دستور تھا کہ اپنے لشکر کی صفوں میں گھوم پھر کر اپنے بہادر سپاہیوں کو ہمت اور جرأت دلاتے۔ ثابت قدمی اور بہادری پر اُکساتے۔ آپ ﷺ کی بہادری اور جوانمردی کو دیکھ کر آپ ﷺ کے ساتھی بھی نڈر ہو کر لڑتے تھے۔[2]

آنحضرت ﷺ کی جنگی مہارت اور عسکری قیادت بھی بے نظیر تھی۔ غزوۂ بدر میں مقامِ بدر کو میدانِ جنگ بنا کر بہترین جنگی مہارت کا ثبوت دیا اور پانی کے کنویں پر قبضہ کر کے دشمنوں کی تمام تدبیروں کو خاک میں ملا دیا۔[3]

جنگِ اُحد میں بھی آپ ﷺ نے فنی مہارت کا بے مثال ثبوت دیا۔ آپ ﷺ نے گھاٹی کے محافظ تیر اندازوں کو حکم دیا تھا کہ وہ گھاٹی کو ہرگز نہ چھوڑیں اور دشمن کے گھوڑوں پر تیر برساتے رہیں کیونکہ گھوڑے تیروں کے مقابلے پر نہیں ٹھہر سکتے۔ جب گھاٹی کے محافظوں نے آنحضرت ﷺ کی ہدایت کے خلاف گھاٹی کو چھوڑ دیا تو دشمنوں نے موقع پا کر گھاٹی کی

---

[1] آل عمران: ۱۰۹/۳، الأصبهاني، أخلاق النبي ﷺ، ص: ۱۸۹، ابن کثیر، البداية والنهاية: ۵۲/۴

[2] صحیح البخاري: ۲۸٦٤، صحیح مسلم: ۱۷۷۵-۱۷۷۹، أحمد باوزیر، مرویات، ص: ۱۷٤

[3] البیهقي، دلائل النبوة: ۳۵/۳

طرف سے مسلمانوں پر حملہ کر دیا۔ آپ ﷺ کی ثابت قدمی، استقامت اور بہادری کی وجہ سے مسلمانوں کی فوج ہزیمت و شکست سے بچ گئی۔[۱]

جنگِ خندق میں آپ ﷺ نے اپنے ساتھیوں سے مشورہ کیا تو حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کی رائے وحی الٰہی کے مطابق نکلی۔ آنحضرت ﷺ نے خندق کھودنے کا حکم دیا، بلکہ خود بھی خندق کھودی۔[۲] عربوں کے لیے خندق کھود کر شہر کی حفاظت کرنا اور دشمنوں کے حملوں کو روکنا بالکل نئی چیز تھی۔ وہ اس طریقۂ جنگ سے بالکل ناواقف تھے۔ جب قریش اور یہودی ہمت ہار کر ناکام واپس چلے گئے تو حضرت رسولِ اکرم ﷺ کی جنگی مہارت و قابلیت اور عسکری قیادت کا سکہ سارے عرب میں بیٹھ گیا۔

صلح حُدَیْبِیَہ بظاہر مسلمانوں کے مفاد کے خلاف نظر آتی تھی لیکن واقعات نے ثابت کر دیا کہ یہ صلح سیاسی اعتبار سے بڑی اہم تھی۔ اس صلح نے مسلمانوں کا سیاسی اقتدار قائم کرنے میں سنگِ میل کا کام دیا۔ یہ صلح نامہ اس بات کی شہادت تھی کہ مسلمان بھی قریش کے مقابلے پر ایک طاقتور سیاسی اور دینی جماعت ہے۔ بین الاقوامی قانون کی رُو سے معاہدہ صرف دو برابر کی قوموں کے درمیان ہو سکتا ہے۔ یہ معاہدہ کر کے قریش نے اس بات کا اعتراف و اقرار کر لیا کہ جزیرۂ عرب میں مسلمانوں کی حکومت قائم ہے۔

جنگِ حُنَین میں آنحضرت ﷺ نے بے نظیر شجاعت اور استقامت کا ثبوت دیا۔ اپنی بہادری اور ثابت قدمی سے میدانِ جنگ سے بھاگتے ہوئے مسلمانوں کو دوبارہ جمع کر کے صفوں کو از سرِ نو ترتیب دیا اور دشمنوں کو مار بھگایا۔

محاصرۂ طائف میں مَنْجَنِیقیں، دبّابے اور دوسرے آلاتِ جنگ استعمال کر کے یہ ثابت کر دیا کہ سالار کی حیثیت میں آپ ﷺ نئے آلاتِ جنگ سے واقف تھے اور جنگی ضرورتوں کے پیش نظر نئے آلات کے بنانے اور استعمال کرنے کے لیے اپنے

---

۱ ابن كثير، البداية و النهاية: ٢٢٨/٤، البيهقي، دلائل النبوة: ٢١٠/٣

۲ ابن كثير، البداية والنهاية: ٢٨٥/٤

سپاہیوں کو دوسرے علاقوں میں تربیت حاصل کرنے کی خاطر بھیجنا بھی اس بات کی شہادت ہے کہ حضرت رسولِ اکرم ﷺ بڑے ماہر سپہ سالار اور فنونِ جنگ سے واقف تھے۔[1]

آپ ﷺ کا یہ بھی دستور تھا کہ دشمنوں کے حالات سے باخبر رہنے کے لیے جاسوس مقرر کرتے جو دشمنوں کی فوجی نقل و حرکت کی اطلاع آپ ﷺ تک پہنچاتے رہتے تھے۔[2]

حضرت رسولِ اکرم ﷺ جب ضروری سمجھتے تو جنگی معاملات میں بڑی راز داری سے کام لیتے۔ فتح مکہ کے لیے لشکر کی تیاری میں بڑی احتیاط برتی گئی اور کوشش کی گئی تھی کہ دشمنوں کو خبر نہ ہونے پائے۔ آپ ﷺ نے یہاں تک کیا کہ لشکر کی روانگی کے وقت تک کسی کو علم نہ ہونے دیا کہ کہاں جا رہے ہیں۔ آپ ﷺ کی جنگی قابلیت کا اندازہ اس بات سے بخوبی ہو سکتا ہے کہ آپ ﷺ نے اپنا مقصد اور منزل فوج پر ظاہر نہ کر کے بلکہ دکھاوے کے لیے چکر کاٹ کر اور نامعلوم راستوں سے گزر کر مکے پہنچے۔ رات کے وقت ساری فوج نے ایک دم آگ روشن کی جس سے مکے والے ڈر کر ہمت ہار بیٹھے۔[3]

سیاسی تدبُّر

حضرت رسولِ مقبول ﷺ بے نظیر سیاسی تدبر اور حکمت و دانش کے مالک تھے۔ جب مشرکین مکہ نے مسلمانوں کو بہت تنگ کیا تو آپ ﷺ نے ہجرت کے لیے ملک حبش کا انتخاب فرما کر بہت سیاسی بصیرت و تدبر کا ثبوت دیا۔ اس وقت اور بھی علاقے تھے، خود جزیرۂ عرب کے بہت سے قبائل تھے۔ نجران اور یمن بھی موجود تھے۔ ملک شام و مصر بھی تھے۔ مگر آپ ﷺ نے ان میں سے کسی کو پسند نہ فرمایا۔ ہر جگہ کوئی نہ کوئی خطرہ نظر آیا۔ صرف حبش کا

---

[1] ابن کثیر، البداية والنهاية: ٤/ ٦١١، الواقدي، المغازي: ٣/ ٩٢٣

[2] صحيح البخاري: ٤٢٨٠، صحيح مسلم: ١٩٠١، ابن سعد، الطبقات الكبرى: ٢/ ٢٣، أحمد باوزير، مرويات غزوة بدر، ص: ٩٥ـ ١٠٠

[3] ابن سيد الناس، عيون الأثر: ٢/ ١٦٦ـ ١٦٨، الواقدي، المغازي: ٢/ ٧٩٦ـ ٨٠٣

علاقہ ایسا تھا کہ آپ ﷺ کی سیاسی بصیرت نے وہاں کوئی خطرہ نہ دیکھا۔ چنانچہ واقعات نے آنحضرت ﷺ کے سیاسی تدبر اور حسن انتخاب کی داد دی۔[1]

آپ ﷺ کی سیاسی حکمت عملی بھی کچھ کم حیرت افزا نہیں۔ آپ ﷺ نے مکہ چھوڑ کر مدینہ کی راہ لی تو جو راستہ اختیار کیا وہ بھی حیرت انگیز اور تعجب خیز ہے۔ اوّل تو آپ ﷺ شاہراہ کو چھوڑ کر ایک غیر معروف راستے پر گامزن ہوئے۔ بُحَیرۂ احمر کے بالمقابل مغربی راستہ پسند فرمایا۔ پھر کبھی اِدھر مڑ جاتے کبھی اُدھر۔ کبھی آپ ﷺ سمندر کے کنارے کنارے چلتے اور کبھی بہت دُور ہٹ کر اندرون ملک میں نکل جاتے۔ مختلف وادیوں اور پہاڑی راستوں کو طے کرتے، پُر پیچ راہوں سے گزرتے اور راستے بدلتے ہوئے آپ ﷺ وادیٔ عقیق میں داخل ہوئے اور وہاں سے قباء میں جا پہنچے۔ مقصد یہ تھا کہ تعاقب کرنے والا دشمن نشان پا کر سراغ نہ لگا سکے۔[2]

مدینے پہنچ کر آپ ﷺ نے سب سے پہلے معاہدۂ مدینہ کی داغ بیل ڈالی۔ اس معاہدہ کی رُو سے مسلمانوں کو ایک مستقل اور الگ قوم قرار دیا۔ ان کے حقوق و فرائض اور باہمی تعلقات کی وضاحت کر دی۔ پھر اسی معاہدے کی رُو سے مدینے کے یہودیوں کے حقوق و فرائض متعین کیے۔ درحقیقت یہ معاہدہ ایک جامع منشور تھا جس کے ذریعے اِسلامی حکومت کی بنیاد قائم کی گئی اور مختلف شہری اور دیہاتی باشندوں کے حقوق کی وضاحت اور تعیین کر دی گئی۔ ایک طرف تو یہ معاہدہ اِسلام کے سیاسی نظام میں پہلا سنگ میل ہے اور دوسری طرف آنحضرت ﷺ کے حسنِ تدبر اور سیاسی بصیرت کا آئینہ دار۔ جزیرۂ عرب کیا، بلکہ ساری دُنیا میں اس منشور نے نئے سیاسی فکر و نظر کی بنیاد رکھی۔ یعنی خاندانی، قبائلی اور وطنی تعلقات کو توڑ کر دینی اور فکری و نظری تعلقات پر حکومت کی بنیادیں اُٹھائی گئیں۔

---

[1] عطية محمود روّاش، النبي و قيادة العالم، ص: ٧٢ ، أحمد إبراهيم الشريف ، مكة والمدينة في الجاهلية وعهد رسول الله ﷺ : ١/٢٢٤ ، علي محمد الصلابي ، السيرة النبوية : ١/٢٧٢

[2] ابن كثير، البداية والنهاية :٣/٤٤٩، ابن الجوزي، الوفا بأحوال المصطفى :١/١٨٩

رنگ ونسل کے امتیازات مٹا کر دین اِسلام اور عقیدۂ توحید کو قومی وحدت کا ذریعہ ٹھہرایا۔ خاندانی شرافت اور قبائلی فخر وغیرہ کا خاتمہ کر کے ذاتی کردار اور انفرادی اعمال کو شرافت وعزت کا معیار قرار دیا۔ مدینے میں قدم رکھتے ہی آپ ﷺ نے اپنے سیاسی تدبّر سے مسلمانوں کو ایک الگ قوم قرار دیا۔ مختلف عناصرِ مدینہ کی شہری آزادی کا اعلان فرمایا۔ مسلمانوں اور یہودیوں کے شہری حقوق وفرائض کی حدود مقرر کر کے اِسلامی نظام حکومت کی بنیاد رکھی۔[1] آنحضرت ﷺ کے سیاسی تدبر وبصیرت کی بہترین مثال صُلح حدیبیہ سے ملتی ہے۔[2]

مشرکین مکہ نے آپ ﷺ سے صلح نامہ کی شرائط طے کر کے اس بات کا اقرار کیا کہ مسلمان ایک مستقل قوم ہے۔ اِسلام ایک قوت اور طاقت کا نام ہے۔ آنحضرت ﷺ ایک جماعت کے قائد اور حکمران ہیں۔ بین الاقوامی قانون کی رُو سے قریش مکہ نے صلح نامہ پر دستخط کر کے کم ازکم اتنا ضرور اعتراف کیا کہ آپ ﷺ ان کے برابر کے اقتدار وحکومت کے مالک ہیں۔

بدترین دشمنوں سے عفو ودرگزر کر کے ان سے بہترین سلوک اور تالیفِ قلوب آپ ﷺ کے سیاسی تدبر کی ایک ادنیٰ مثال ہے۔

---

[1] ابن کثیر، البدایة والنهایة: ۳/۵۰۴

[2] صحیح مسلم: ۱۷۸۳-۱۷۸۶

۲۔ عہدِ نبوی میں نظامِ سلطنت

حضرت رسولِ مقبول ﷺ نے مدینے میں تشریف لانے کے بعد ایک ایسی حکومت کی بنیاد رکھی جو نہ شخصی تھی نہ جمہوری۔ آپ ﷺ کی ذات بابرکات تمام قوانین اور نظامِ حکومت کا سرچشمہ تھی، مگر ضرورت کے وقت آپ ﷺ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مشورہ بھی کرتے اور اگر ان کی رائے قابل قبول ہوتی تو اسے نافذ کرنے کا حکم صادر فرما دیتے تھے۔[۱]

جب کسی قبیلے کا وفد آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوتا تو آپ ﷺ اسے حکم دیتے کہ اپنے قبیلے کے لوگوں کو دین سکھائیں۔[۲] آپ ﷺ تبلیغ دین میں نرمی کرنے اور ظلم کو سختی سے روکنے کی تلقین فرمایا کرتے تھے۔[۳]

مالیات

آنحضرت ﷺ نے زکوٰۃ و صدقات کی فراہمی کے لیے ہر قبیلے، ہر گاؤں اور ہر شہر میں عامل، امیر اور والی مقرر کر دیے تھے۔[۴] آپ ﷺ اس بات پر زور دیا کرتے تھے کہ زکوٰۃ اور صدقات کی فراہمی باقاعدہ کی جائے تاکہ غریب لوگ اپنے امیر بھائیوں کی دولت سے کچھ حصہ حاصل کر سکیں۔[۵]

آپ ﷺ کے مبارک عہد میں آمدنی کے ذرائع یہ تھے:

۱۔ فَیْء: جس علاقے پر لشکر کشی کی جائے لیکن عملی لڑائی سے پہلے ہی دشمن صلح یا اطاعت

---

۱ ابن كثير، البداية والنهاية :٤/٥٢، الأصبهاني، أخلاق النبي ﷺ، ص: ١٨٩

۲ صحيح البخاري :٨٧، صحيح مسلم :١٧

۳ صحيح البخاري:٦٩، صحيح مسلم:١٧٣٢ـ ١٧٣٤

۴ المقريزي، إمتاع الأسماع :٩/٣٧٦، السهيلي، الروض الأنف:٤/٢٢٠

۵ صحيح البخاري:١٣٩٥، صحيح مسلم : ١٩

قبول کر لے تو اس کی زمین کا لگان فَیْ کہلاتا ہے۔

۲۔ خَراج: جو علاقے صلح کے ذریعے اسلام کے قبضے میں آئیں، وہاں کی زمین کا لگان خراج کہلاتا ہے۔ یا ان علاقوں کی زمین کا لگان جو بزورِ شمشیر فتح ہوئے لیکن وہ زمین اصل باشندوں کے قبضہ میں رہی۔

۳۔ جِزیہ: وہ ٹیکس ہے جو اہلِ کتاب (یہود و نصاریٰ) پر فوجی خدمات کے معاوضے میں عائد کیا جاتا تھا۔ جزیرۂ عرب میں جزیہ صرف اہلِ کتاب سے وصول کیا جاتا تھا، مشرکین سے نہیں۔

۴۔ عُشر: اس زمین کی زکوٰۃ جس کے مالک مسلمان ہو گئے تھے۔ یا وہ زمین جو فتح کے بعد غازیوں کے درمیان تقسیم کر دی گئی تھی۔

۵۔ اَنفال: لڑائی میں جو مالِ غنیمت ہاتھ آئے، اَنفال کہلاتا ہے۔

۶۔ زکوٰۃ: نقدی اور مال مویشی وغیرہ میں مقررہ نصاب کی ادائیگی۔

۷۔ صدقات: اللہ کی راہ میں خرچ کرنا۔[1]

افسروں کا انتخاب

رسولِ خدا ﷺ کی عادت مبارک تھی کہ آپ ﷺ گورنروں اور افسرانِ مال کا تقرر کرتے وقت ان کی ذاتی قابلیت، دینداری اور حلم و فضل کا خاص خیال رکھتے تھے۔ آپ ﷺ ہمیشہ ایسے لوگوں کو مقرر کرتے جو عربوں میں عزت و احترام کی نظر سے دیکھے جائیں۔ جنھیں ہر دلعزیزی حاصل ہو سکے اور جو اپنے فرائض کو باحسن وجوہ انجام دے سکیں۔

نبی کریم ﷺ اپنے افسرانِ مال اور صوبائی حکام کے بارے میں حالات دریافت کرتے رہتے تھے۔ غیر موزوں اور غیر ہر دلعزیز افسروں اور عاملوں کو معزول بھی فرما دیتے تھے۔ ایک مرتبہ بحرین سے قبیلۂ عبدالقیس کا وفد آپ ﷺ کی خدمت میں

---

[1] ان تمام کے معانی کے لیے دیکھیں جرجانی کی کتاب "التعریفات" اور عبدالرؤف مناوی کی "التوقیف علی مهمات التعاریف"

حاضر ہوا۔ وفد نے وہاں کے عامل علاء بن حضرمی رضی اللہ عنہ کی شکایت کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آپ ﷺ نے اسے معزول کر کے ابان بن سعید رضی اللہ عنہ کو بحرین کا عامل نامزد کر دیا اور حکم دیا کہ قبیلۂ عبدالقیس سے اچھا سلوک کرے اور اس کے سرداروں سے عزت سے پیش آئے۔[1]

حساب کی پڑتال

نبی کریم ﷺ کی عادت تھی کہ آپ ﷺ افسرانِ مال سے حساب کے بارے میں آمد و خرچ کی پوری تفاصیل کی پڑتال فرمایا کرتے تھے۔ ایک دفعہ آپ ﷺ نے ایک شخص کو صدقات کی وصولی کے لیے مقرر فرمایا۔ جب وہ شخص واپس آیا تو آپ ﷺ نے حساب کی پڑتال فرمائی۔ وہ شخص عرض کرنے لگا کہ یہ مال آپ کا ہے اور یہ مال مجھے بطور ہدیہ ملا ہے۔ یہ سن کر نبی کریم ﷺ فرمانے لگے کہ ''کتنی عجیب بات ہے کہ ہم ایک شخص کو مال افسر بنا کر بھیجتے ہیں تاکہ اللہ تعالیٰ کے عطا کیے ہوئے علاقوں میں صدقات کی فراہمی کرے اور وہ شخص آکر یہ کہتا ہے کہ یہ مال تمھارا ہے اور یہ مجھے بطور ہدیہ ملا ہے۔ مزا تو تب تھا کہ وہ اپنے ماں باپ کے پاس بیٹھا رہتا اور پھر دیکھتا کہ یہ مال اسے بطور ہدیہ ملتا ہے یا نہیں۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا:

> ''ہم جس شخص کو افسر اور عامل بنا کر کسی علاقے میں بھیجتے ہیں اور اس کی تنخواہ مقرر کر دیتے ہیں تو اس کے بعد اگر وہ کوئی چیز بھی لیتا ہے تو خیانت کرتا ہے۔''[2]

مجلسِ مشاورت

آپ ﷺ ہر کام میں مشورہ کرتے تھے۔ اس مقصد کے لیے آپ ﷺ نے سات مہاجرین اور سات انصار کی ایک مجلس مشاورت قائم کر رکھی تھی، جن میں حضرت حمزہ، حضرت جعفر، حضرت ابوبکر، حضرت عمر، حضرت علی، حضرت ابن مسعود، حضرت عمار،

[1] ابن حجر، الإصابة: ۳۳/۱، ابن عبد البر، الاستيعاب: ۱۵۹/۱، ابن الأثير، أسد الغابة: ۴۳/۱

[2] صحيح البخاري: ۷۱۷۴، ۷۱۹۷، صحيح مسلم: ۱۸۳۲۔۱۸۳۳، صحيح ابن حبان: ۴۵۱۵

حضرت حُذیفہ، حضرت ابوذر، حضرت بلال اور حضرت مقداد رضی اللہ عنہم بھی تھے۔[1]

عہدیداران عہد نبوی

عہد نبوی کے دفتری نظام یا سیکرٹریٹ کا اجمالی خاکہ حسب ذیل ہے:

آپ ﷺ کے عہد میمنت میں دستاویزیں، یادداشتیں اور قرآن لکھنے کے لیے چند صحابہ رضی اللہ عنہم مقرر تھے۔ یہ لوگ عربوں کی اصطلاح میں "کامل" کہلاتے تھے۔ یعنی جو عربی لکھنے، تیر اندازی اور پیرنے میں پوری مہارت رکھتے تھے۔ ان میں حضرت ابوبکر، حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت علی، حضرت خالد بن سعید، حضرت خالد بن ولید، حضرت مغیرہ، حضرت معاویہ، حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہم کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ویسے آپ ﷺ کے کاتبوں کی تعداد ۴۲ تک پہنچتی ہے۔ (چند ایک کے نام اور ذمہ داریاں درج ذیل ہیں)

☆ حضرت علی رضی اللہ عنہ عہد نامے اور صلح نامے لکھا کرتے تھے۔

☆ حضرت حُذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ صیغۂ راز کے مہتمم تھے۔

☆ حضرت حارث بن عوف مُرّی رضی اللہ عنہ محکمہ مہر (خاتم) کے ناظم تھے۔ آپ ﷺ کی مہر حضرت حَنظلہ بن ربیع رضی اللہ عنہ کے سپرد بھی رہی۔

☆ حضرت معیقیب بن ابی فاطمہ رضی اللہ عنہ اور حضرت کعب بن عمرو انصاری رضی اللہ عنہ مالِ غنیمت کا اندراج کیا کرتے تھے۔ (یعنی سیکرٹری ملٹری فنانس)

☆ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ حجاز کی کھجوروں کی آمدنی لکھنے پر مامور تھے۔

☆ حضرت زبیر بن عوّام رضی اللہ عنہ اور جَہم بن صَلت رضی اللہ عنہ صدقات کی آمدنی لکھنے پر مامور تھے۔ (وزیر مالیات)

☆ حضرت مُغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ اور حُصَین بن نُمیر رضی اللہ عنہ قرضے، لین دین اور معاملات لکھنے کے فرائض انجام دیتے تھے۔ (رجسٹرار)

☆ حضرت عبداللہ بن اَرقم رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کی طرف سے بادشاہوں اور حکمرانوں کے خطوط

[1] مسند أحمد: ٦٦٥، ١٢٦٣

کے جواب لکھا کرتے تھے (گویا انھیں وزیر خارجہ کے اختیارات تھے)۔

☆ آپ ﷺ کے خطیب حضرت ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ تھے۔

☆ فارسی، رومی، قبطی، عبرانی اور حبشی زبانوں میں ترجمان کے فرائض حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ انجام دیتے تھے۔[1]

☆ آپ ﷺ کے عہد میں حضرت شفاء اُمّ سلمان رضی اللہ عنہا عورتوں کو لکھنا سکھاتی تھیں۔[2]

☆ حضرت عُبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ اہل صُفّہ کو قرآن پڑھاتے تھے۔[3]

☆ عہد نبوی میں مدینے کے پہلے قاضی حضرت عبداللہ بن نوفل رضی اللہ عنہ مقرر ہوئے۔[4] اور پہلے مبلغ حضرت مُصعَب بن عُمیر رضی اللہ عنہ تھے۔[5]

☆ آپ ﷺ کا جھنڈا عقاب کے نام سے مشہور تھا۔ یہ پشم کا بنا ہوا تھا اور اس پر "لَآ إِلٰـهَ إِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللّٰهِ" لکھا ہوا تھا۔[6]

تنخواہیں

حضرت رسولِ اکرم ﷺ نے حضرت عتّاب بن اُسید رضی اللہ عنہ کو مکے کا والی مقرر کیا اور ایک درہم روزانہ ان کی تنخواہ مقرر کی۔[7] بعض افسروں کی تنخواہ نقدی کی صورت میں نہ تھی بلکہ جنس میں ادا ہوتی تھی۔ بعض والیوں اور عاملوں کے لیے جاگیروں کی آمدنی کا حصہ مقرر کر دیا گیا تھا۔[8]

[1] ابن سيد الناس، عيون الأثر:٢/٣١٥، مصطفى الأعظمي، كُتّاب النبي ﷺ، ص:١٤٨،٣٥، ابن حبيب، المحبر، ص:٣٧٧

[2] ابن الأثير، أسد الغابة:٥/٤٨٦، ابن عبدالبر، الاستيعاب:٤/٤٢٣

[3] سنن أبي داود:٣٤١٦، سنن ابن ماجه:٢١٥٧

[4] ابن حجر، الإصابة:٦/٤٠٤

[5] صحيح البخاري:٣٩٢٤-٣٩٢٥-٤٩٤١، ابن حجر، الإصابة:١٠/١٨٣

[6] الأصبهاني، أخلاق النبي ﷺ، ص:١١٣-١١٤، ح:٤٢٧-٤٣٠

[7] ابن الأثير، أسد الغابة:٣/٣٥٨-٣٥٩، ابن حجر، الإصابة:٧/٦٢

[8] أبو عبيد، كتاب الأموال، ص:٢٧٢

سفیر

سن ۷ ہجری میں آپ ﷺ نے حضرت دِحیہ کلبی رضی اللہ عنہ کو ہرقل شاہِ روم کے پاس تبلیغی خط دے کر بھیجا۔ اسی طرح حضرت عبداللہ بن حُذافہ سہمی رضی اللہ عنہ کو کسریٰ کے پاس، حضرت عمرو بن اُمیہ رضی اللہ عنہ کو نجاشی کے پاس، حضرت حاطب بن ابی بلتعہ رضی اللہ عنہ کو مُقوقس حاکم مصر کے پاس، حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کو شاہِ عُمان کے پاس، سَلیط بن عمرو رضی اللہ عنہ کو حاکم یمامہ کے پاس، حضرت علاء بن حضرمی رضی اللہ عنہ کو سلطان بحرین کے پاس، حضرت شجاع بن وہب اسدی رضی اللہ عنہ کو غسانی حکمران کے پاس اور مہاجر بن ابی اُمیہ رضی اللہ عنہ کو شاہِ یمن کے پاس بھیجا اور ان سب حکمرانوں کو اسلام کی دعوت دی۔[1]

وفود کی آمد

سن ۹، ۱۰ ہجری میں عرب قبائل کے بہت سے وفود آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہونے کے لیے مدینے پہنچے۔ آپ ﷺ ہر وفد سے ان کی قبائلی بولیوں میں گفتگو فرماتے، جس طرح ہمارے ہاں مختلف اضلاع میں مختلف الفاظ مروّج ہیں۔ اسی طرح عرب قبائل میں بھی مخصوص الفاظ رائج تھے۔ آپ ﷺ ہر قبیلے سے اس کی بولی میں گفتگو فرماتے تھے۔ ایک دن آپ ﷺ بنو نَہد کے وفد سے گفتگو فرما رہے تھے، حضرت علی رضی اللہ عنہ سن کر حیران ہوئے اور عرض کرنے لگے: یا رسول اللہ! ہم ایک ہی باپ دادا کی اولاد ہیں، میں دیکھتا ہوں کہ آپ عربوں کے وفود سے ایسے الفاظ میں گفتگو فرماتے ہیں جو ہم نہیں سمجھتے۔

آپ ﷺ نے فرمایا: ''میرے رب نے مجھے خود ہی تعلیم و تربیت دی ہے۔''[2]

جب نجران کے عیسائیوں کا وفد حاضر ہوا تو آپ ﷺ نے انھیں اجازت دی کہ وہ

[1] ابن الجوزي، الوفا: ۲/۲۵۵-۲۷۱، ابن سید الناس، عیون الأثر: ۲/۲٦۰-۲۷۰

[2] الهندي، كنز العمال: ۱۸٦۷۳

مسجد نبوی میں اپنے طریقے کے مطابق عبادت کر لیں۔[1]

مالی نظام

عہدِ نبوی میں مال و دولت جمع کرنے کے لیے کوئی بیت المال نہ تھا۔ جب بھی مال اور روپیہ آتا تو آپ ﷺ اپنے گھر اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے گھروں میں بحفاظت رکھ دیتے۔ مال مویشی یعنی اونٹ، گھوڑے، خچر وغیرہ تو جس دن آتے اسی دن تقسیم کر دیے جاتے تھے۔[2]

شادی شدہ لوگوں کو غیر شادی شدہ کی نسبت دو چند حصہ ملتا تھا۔ مسلمانوں کے ایثار کا یہ حال تھا کہ جب کسی کو ضرورت نہ ہوتی تو لینے سے انکار کر دیتے اور ضرورت مند مسلمان کے گھر کا پتہ دے دیتے کہ وہاں لے جاؤ۔[3]

رجسٹر مردم شماری

ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا کہ مسلمانوں کی مردم شماری کی جائے۔ چنانچہ ایک رجسٹر بنایا گیا اور اس میں ۱۵۰۰ مردوں کے نام درج کیے گئے۔[4]

فوجی نظام

عہدِ نبوی میں کوئی باقاعدہ فوج نہ تھی۔ ہر مسلمان سپاہی تھا اور جنگ کے وقت خدا کی راہ میں لڑنا ہر مسلمان کا قومی اور دینی فرض تھا۔ تلوار، تیر، نیزہ، کمان اور برچھی اس زمانے کے مشہور ہتھیار تھے۔ جنگ میں حفاظت کے لیے زرہ، خود اور ڈھال کا استعمال

---

[1] ابن هشام، السيرة النبوية: ١/٥٧٤، ابن سيد الناس، عيون الأثر: ١/٢٢٠، السهيلي، الروض الأنف: ٣/٣

[2] البيهقي، دلائل النبوة: ٥/١٧٨، الواقدي، المغازي: ٣/٩٤٩

[3] صحيح البخاري: ٤٨٨٩، تفسير القرطبي: ٢٠/٣٦٨-٣٦٩، البيهقي، دلائل النبوة: ٥/١٧١، تفسير ابن عطية: ١٤/٣٧٨

[4] صحيح البخاري: ٣٠٦٠، البغوي، شرح السنة: ٢٧٤٤

بھی ہوتا تھا۔[1]

جنگِ حُنین میں منجنیق، دبابے، ضبور وغیرہ بھی استعمال کیے گئے۔[2] یہی آلات اس زمانے کی توپیں اور ٹینک تھے۔ جُرش کے علاقے میں چند نوجوان مسلمانوں کو بھیجا گیا تاکہ آلاتِ حرب بنانا اور استعمال کرنا سیکھیں۔[3]

عہدِ نبوی میں مسلمان عورتیں بھی جنگ میں شرکت کرتی تھیں، البتہ ان کا کام یہ ہوتا تھا کہ زخمیوں کی مرہم پٹی کریں، مجاہدینِ اسلام کے لیے کھانا پکائیں، میدانِ جنگ میں پانی پلائیں، بیماروں کی خبر گیری کریں اور مالِ غنیمت سنبھالیں۔[4]

اس مختصر خاکے سے یہ بات روزِ روشن کی طرح واضح ہے کہ حضرت رسولِ مقبول ﷺ نے علم وحلم سے عاری قوم کو ایسا باضابطہ نظامِ حکومت عطا فرمایا جس میں سلطنت کے تمام اُمور مختلف شعبوں اور محکموں میں تقسیم کر کے قابلِ اعتماد اور لائق ترین لوگوں کے سپرد کر دیے۔ مختلف عہدیداروں اور افسروں کی فہرست مذکورہ پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ نے ایک نہایت عمدہ قابلِ رشک نظامِ حکومت کی بنیاد رکھی۔ عہدوں اور محکموں کی تقسیم تو ایک اچھے خاصے سیکرٹریٹ کا پتہ دیتی ہے۔ اگر ان تمام شعبوں کا بنظرِ غائر مطالعہ کیا جائے تو ایک مکمل دینی جمہوری سلطنت نظر آتی ہے جس میں عصرِ حاضر کے تمام محکمے اور وزارتیں موجود ہیں۔

مختصر یہ کہ حضرت رسولِ اکرم ﷺ نے ایک نہایت تھوڑی مدت میں جزیرۂ عرب کی حالت یکسر بدل ڈالی۔ عربوں کو اور پھر ان کے ذریعے تمام دُنیا کو ایک نیا معاشرہ، نئی تہذیب، نئے عقائد، نیا دین، نیا اندازِ حکومت اور نئے اُصولِ زندگی عطا کیے۔

---

[1] الأصبهاني، أخلاق النبي ﷺ، ص:۱۰۸

[2] المقريزي، إمتاع الأسماع: ۲۹/۱۴

[3] ابن كثير، البداية والنهاية: ۶۱۱/۴، الواقدي، المغازي: ۹۲۳/۳-۹۲۴

[4] صحيح البخاري: ۲۸۷۵-۲۸۷۷-۲۸۸۳، صحيح مسلم: ۱۸۱۲، سنن ابن ماجه: ۲۸۵۶

۳۔ ازواج النبی ﷺ

آنحضرت ﷺ کی ازواج مطہرات کے اسمائے گرامی حسبِ ذیل ہیں:

۱۔ اُمّ المومنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ بنت خُویلد رضی اللہ عنہا

۲۔ اُمّ المومنین حضرت سَودہ بنت زَمعہ رضی اللہ عنہا

۳۔ اُمّ المومنین حضرت عائشہ صِدّیقہ بنت الصدّیق رضی اللہ عنہا

۴۔ اُمّ المومنین حضرت حَفصہ بنت الفاروق رضی اللہ عنہا

۵۔ اُمّ المومنین حضرت زینب بنت خُزیمہ رضی اللہ عنہا

۶۔ اُمّ المومنین حضرت اُم سَلَمہ بنت ابی اُمیہ رضی اللہ عنہا

۷۔ اُمّ المومنین حضرت زینب بنت جَحش رضی اللہ عنہا

۸۔ اُمّ المومنین حضرت جُویریہ بنت الحارث رضی اللہ عنہا

۹۔ اُمّ المومنین حضرت صَفیّہ بنت حُیَیّ رضی اللہ عنہا

۱۰۔ اُمّ المومنین حضرت اُم حبیبہ بنت ابی سفیان رضی اللہ عنہا

۱۱۔ اُمّ المومنین حضرت میمونہ بنت الحارث رضی اللہ عنہا[1]

آنحضرت ﷺ کے ہر نکاح میں کوئی نہ کوئی مصلحت اور مقصد کارفرما نظر آتا ہے۔ خواہ یہ مصلحت اجتماعی ہو یا دینی۔

---

[1] تفصیل کے لیے دیکھیے: المحبر، ص: ۷۷، کتاب ازواج النبي ﷺ للصالحي، نساء في ظل رسول اللہ ﷺ لعرفان العشا حسّونة، في رحاب أمهات المومنين لأم إسراء بنت عرفة بيّومي، السمط الثمين في مناقب أمهات المؤمنين لمحب الدين الطبري۔

(الف) عربوں کے معاشرے میں دینی مقاصد اور اجتماعی فوائد کے لیے مختلف قبائل سے رشتہ نکاح ضروری تھا۔

(ب) آنحضرت ﷺ کا پیغام عورتوں اور مردوں کے لیے یکساں تھا۔ تبلیغی مقاصد کے پیش نظر بے شمار احکام ربانی کو ہر دو جنسوں تک پہنچانا ضروری تھا۔ عورتوں کے بہت سے مسائل ایسے ہیں جو عورتیں مردوں سے پوچھنا یا سننا پسند نہیں کرتیں۔ ان مسائل کی تشریح وتبلیغ کے لیے عورتیں ہی موزوں تھیں۔

(ج) آنحضرت ﷺ کے عقد نکاح میں آجانا بہت بڑی عزت اور بزرگی تھی۔ اس طرح شرفِ زوجیت بخش کر آپ چند مصیبت زدہ خواتین کی دلجوئی فرمانا چاہتے تھے۔

☆ آنحضرت ﷺ کا پہلا نکاح حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے ہوا۔ اس وقت آپ ﷺ کی عمر ۲۵ برس اور حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی عمر ۴۰ برس تھی۔ نکاح کی درخواست حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی طرف سے ہوئی تھی۔ اور وہ پہلے دو مرتبہ بیوہ ہو چکی تھیں۔ سن ۱۰ نبوّت تک حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا زندہ رہیں۔ پچیس سال کے اس طویل عرصے میں آنحضرت ﷺ نے دوسرا نکاح نہیں کیا۔[1]

گویا کہ پچیس برس کی عمر سے لے کر پچاس برس کی عمر تک یعنی بھرپور شباب کا پورا زمانہ آپ ﷺ نے صرف ایک ہی نکاح پر اکتفا کیا۔

اب ان اشارات کو پیش نظر رکھتے ہوئے آپ ﷺ کے ہر نکاح پر ایک نظر ڈالیے اور دیکھیے کہ اس کا پس منظر اور وجوہات کیا ہیں؟ یہ بات بھی یاد رہے کہ ہجرت کے وقت آپ ﷺ کی عمر ۵۳ برس تھی۔[2]

☆ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی وفات کے بعد آپ ﷺ نے حضرت سَودہ رضی اللہ عنہا سے نکاح کر

---

[1] ابن كثير، البداية والنهاية :۳/۸۶، ابن إسحاق، السيرة النبوية :۱۲۸

[2] صحيح البخاري:۳۹۰۲-۳۹۰۳

لیا۔ اس وقت حضرت سودہ رضی اللہ عنہا کی عمر ۵۰ برس سے زائد تھی۔ حضرت سودہ رضی اللہ عنہا اور ان کے شوہر مسلمان ہونے کے بعد ہجرت کر کے ملک حبش میں جا آباد ہوئے۔ حضرت سودہ رضی اللہ عنہا کے خاوند حضرت سکران بن عَمرو رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد آپ ﷺ نے ایک ایسی بوڑھی بیوہ کی دلجوئی فرمائی جس کا شوہر اپنے عقیدے کی خاطر وطن عزیز اور خویش و اقارب کو چھوڑ کر پردیس کی مصیبتیں جھیلتا رہا۔ ایسی بوڑھی بیوہ بڑی غمزدہ اور بے یار و مددگار تھی۔ اس کا باپ بہت بوڑھا اور ضعیف و ناتواں ہو چکا تھا۔ آپ ﷺ نے ازراہِ شفقت و دلجوئی حضرت سودہ رضی اللہ عنہا کو ہجرت سے چند ماہ پیشتر اپنے عقدِ نکاح میں لے لیا۔[1]

☆ اُمّ المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے نکاح کا ایک مقصد تو یہ تھا کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو ان کے ایثار و قربانی کا صلہ دیا جائے اور دوسرا مقصد یہ تھا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ذریعے سے عورتوں کے مسائل و احکام کی تبلیغ و تشریح کر دی جائے کیونکہ اُمّ المومنین حضرت عائشہ صِدّیقہ رضی اللہ عنہا ازواج مطہرات میں سب سے کم عمر تھیں۔ مسائل کو سمجھنے اور پہچاننے کا سلیقہ بہت زیادہ تھا۔ حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا کی دو ہزار سے زائد (۲۲۱۰) احادیث کتابوں میں موجود ہیں۔[2]

☆ حضرت حَفصہ بنت الفاروق رضی اللہ عنہا کے شوہر غزوۂ بدر میں شہید ہوگئے تھے۔ آنحضرت ﷺ نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی کی دلجوئی کی خاطر انھیں سن ۳ ہجری میں اپنے نکاح میں لے لیا۔[3]

☆ حضرت زینب بنت خُزیمہ رضی اللہ عنہا کا پہلا نکاح طفیل سے، دوسرا عبیدہ سے اور تیسرا عبداللہ بن جَحش رضی اللہ عنہ سے ہوا۔ جب حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ جنگِ اُحُد میں شہید ہو گئے تو

---

[1] ابن الجوزي، الوفا بأحوال المصطفى :۲/۲۰٤، ابن كثير، الفصول، ص :۲٤۳

[2] ابن الأثير،الكامل :۲/۳۰۷ ، ابن عبد البر،الاستيعاب :٤/٤۳٥-٤۳۹ ، السجستاني، مسند عائشة رضي الله عنها، ص:۳، ابن الجوزي ، تلقيح فهوم أهل الأثر ، ص: ۳٦۳

[3] ابن حجر، الإصابة :۱۳/۲۸٥

آنحضرت ﷺ نے سن ۳ ہجری میں ان سے نکاح کر لیا۔ نکاح کے بعد صرف دو تین مہینے زندہ رہیں۔[1]

☆ حضرت اُم سلمہ رضی اللہ عنہا اسلام لانے کے بعد بڑے مصائب اور تکالیف سے دو چار ہوئیں۔ پہلے ہجرت حبش میں شریک ہوئیں، پھر واپس آ کر مدینے کو ہجرت کی۔ اِسلام کی خاطر بڑی تکلیفیں اُٹھائیں۔ ان کے شوہر ابو سلمہ رضی اللہ عنہ نے جنگِ بدر و اُحد میں شرکت کی اور غزوۂ اُحد میں شہادت پائی۔ ان کے ایثار اور قربانی کے پیش نظر ابوسلمہ کی شہادت کے بعد آنحضرت ﷺ نے ان سے سن ۴ ہجری میں نکاح کر لیا۔[2]

☆ حضرت اُم حبیبہ رضی اللہ عنہا نہایت قدیم الاِسلام تھیں۔ وہ اور ان کا شوہر ملک حَبَش کو ہجرت کر گئے تھے لیکن ان کا شوہر عیسائیوں میں بیٹھ کر عیسائی ہو گیا، مگر وہ اِسلام پر قائم رہیں۔ اُنھوں نے اِسلام کی خاطر وطن عزیز کو چھوڑا۔ خویش و اقارب کو خیر باد کہا۔ پردیس میں خاوند کا سہارا تھا۔ جب وہ بھی مرتد ہو گیا تو یہ سہارا بھی ٹوٹ گیا۔ جب آنحضرت ﷺ نے یہ خبر سنی تو نکاح کا پیغام بھیج کر اپنے عقد میں لے لیا۔[3]

☆ حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا کا پہلا نکاح حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ سے ہوا تھا۔ حضرت زید بچپن سے آپ ﷺ کی خدمت میں رہے۔ لوگوں میں یہ مشہور ہو گیا کہ زید رضی اللہ عنہ آنحضرت ﷺ کے متبنّٰی اور منہ بولے بیٹے ہیں۔ خدا تعالیٰ کو یہ منظور تھا کہ حضرت زینب اور زید کے نکاح کے بعد طلاق ہو جائے اور حکمت یہ تھی کہ جاہلیت کی ایک رسم کو توڑا جائے۔ عرب منہ بولے فرزند کو حقیقی بیٹے کا درجہ دے کر اس کی بیوی

---

[1] ابن الأثير، أسد الغابة: ۲۹۷/۵، ابن عبد البر، الاستيعاب: ۴۰۹/۴

[2] ابن عبد البر، الاستيعاب: ۴۹۳/۴، ابن الجوزي، الوفا بأحوال المصطفیٰ: ۲۰۴/۲

[3] محب الدين الطبري، السمط الثمين، ص: ۱۴۴

سے شادی بیاہ جائز نہ سمجھتے تھے۔ حضرت زید رضی اللہ عنہ نے حضرت زینب رضی اللہ عنہا کو طلاق دے دی تو آنحضرت ﷺ نے حضرت زینب رضی اللہ عنہا کو اپنے عقد نکاح میں لے کر جاہلیت کے رسم ورواج اور تصورات کو باطل ٹھیرادیا۔[1]

☆ حضرت جُویریہ رضی اللہ عنہا بنو مُصطلق کے سردار کی بیٹی تھیں۔ سن ۵ ہجری میں جنگی قیدیوں میں حضرت ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ کے ہاتھ آئیں۔ حضرت ثابت رضی اللہ عنہ زرِ فدیہ لے کر آزاد کرنے کے لیے آمادہ تھے لیکن حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا کے پاس کچھ بھی نہ تھا۔ وہ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور آزادی وحُریّت حاصل کرنے کے لیے آپ ﷺ کی اعانت چاہی اور ساتھ ہی اپنے خاندان کی شرافت وعزت کا تذکرہ کیا۔ آپ ﷺ نے اس کا زرِ فدیہ ادا کر کے اسے آزاد کر دیا۔ پھر اس کی خاندانی سیادت وبزرگی کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس کو عقد نکاح میں لے لیا۔ بنو مصطلق کی یہ عزت افزائی دیکھ کر تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اپنے اسیرانِ جنگ کو آزاد کر دیا۔ بنو مصطلق نے یہ حسن سلوک دیکھا تو وہ اِسلام لے آئے۔ اس طرح حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا کا آنحضرت ﷺ سے نکاح دوگونہ فوائد کا باعث ہوا۔ ایک تو بنو مصطلق کے قیدیوں کو رہائی مل گئی، دوسرے بنو مصطلق اِسلام کی نعمت سے بہرہ اندوز ہوئے۔[2]

☆ حضرت صَفیہ بنت حُیَیّ رضی اللہ عنہا ایک معزز یہودی خاتون اور یہودی سردار کی بیٹی تھیں۔ اُن کا باپ حُیَیّ اور ان کا خاوند کنانہ بن ابی الحُقَیق دونوں مارے گئے تھے۔ حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا جنگی قیدیوں میں گرفتار ہوکر آنحضرت ﷺ کے حصے میں آئی تھیں۔ آپ ﷺ نے اسے آزاد کر کے اپنے عقد نکاح میں لے لیا۔ ایک سردار کی بیٹی اور معزز خاتون کی دلجوئی اور شرافت کا یہی تقاضا تھا کہ وہ حرمِ

[1] ابن عبد البر، الاستیعاب: ٤٠٦/٤

[2] ابن حجر، الإصابة: ٢٥٦/١٣، ابن عبد البر، الاستیعاب: ٣٦٧/٤

رسول کا شرف پائے۔[1]

☆ حضرت میمونہ بنت حارث رضی اللہ عنہا مکے کی بڑی معزز خاتون تھیں۔ ان کے دو شوہر وفات پا چکے تھے۔ آنحضرت ﷺ نے سن ۷ ہجری میں عمرہ کیا تو حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے ان کے متعلق آپ ﷺ سے ذکر کیا۔ نبی کریم ﷺ نے ان کی دلجوئی کی خاطر ان سے نکاح کر لیا۔[2]

---

1. ابن الجوزي، الوفا: ۲/۲۰٤
2. الصالحي، كتاب الزواج النبي، ص: ۱۹۷

۴۔ اولادِ نبی ﷺ

آنحضرت ﷺ کے تین بیٹے اور چار بیٹیاں تھیں۔ پہلے مولود حضرت قاسم رضی اللہ عنہ تھے۔ یہ حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کے بطن سے پیدا ہوئے۔ بچپن میں داغِ مفارقت دے گئے تھے۔ اُنھی کے نام پر آپ ﷺ کی کنیت ابوالقاسم تھی۔

آپ ﷺ کے دوسرے فرزند حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ تھے۔ ان کا لقب طیب اور طاہر بھی تھا۔ آپ مکہ مکرمہ میں بعثت نبوی کے بعد پیدا ہوئے اور وہیں وفات پائی۔

تیسرے فرزند مدینے میں حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ ماریہ خاتون کے بطن سے سن ۸ ہجری میں پیدا ہوئے تھے۔ ابھی دودھ پیتے بچے ہی تھے کہ سن ۱۰ ہجری میں اللہ کو پیارے ہو گئے۔

نبی کریم ﷺ کی چاروں دختران طاہران حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے بطن سے ہیں۔ سب دختران کی ولادت مکہ مکرمہ میں ہوئی۔

۱۔ حضرت زینب رضی اللہ عنہا، حضرت قاسم رضی اللہ عنہ سے چھوٹی اور باقی اولاد سے بڑی تھیں۔
۲۔ حضرت رُقیّہ رضی اللہ عنہا حضرت زینب رضی اللہ عنہا سے چھوٹی تھیں۔
۳۔ حضرت اُم کلثوم رضی اللہ عنہا، حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا سے چھوٹی تھیں۔
۴۔ حضرت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا حضرت اُم کلثوم رضی اللہ عنہا سے چھوٹی تھیں۔[1]

حضرت زینب رضی اللہ عنہا کی پیدائش کے وقت آنحضرت ﷺ کی عمر ۳۰ سال کی تھی۔ حضرت زینب رضی اللہ عنہا اپنی والدہ ماجدہ کے ساتھ ہی ایمان لے آئی تھیں لیکن ان کے شوہر سن ۶ ہجری کے بعد مسلمان ہوئے۔[2]

---

[1] ابن القيم، زاد المعاد: ۱۰۳/۱ ، ابن هشام ، السيرة النبوية: ۱۹۰/۱ ، النووي ، تهذيب الأسماء واللغات: ۲٦/۱

[2] محمد أحمد عيسى ، بنات الرسولؐ، ص: ٦۱

آنحضرت ﷺ کی عمر ۳۳ برس کی تھی کہ حضرت رُقَیّہ رضی اللہ عنہا پیدا ہوئیں۔ان کا نکاح مکے میں حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ سے ہوا تھا۔ پہلے حبشہ کو ہجرت کی، پھر ہجرت کر کے مدینہ آ گئے۔ حضرت رُقیہ رضی اللہ عنہا نے سن ۲ ہجری میں انتقال فرمایا۔[1]

سیدہ اُم کلثوم رضی اللہ عنہا آنحضرت ﷺ کی تیسری دختر ہیں۔سیدہ رُقیہ رضی اللہ عنہا کی وفات کے بعد حضرت اُم کلثوم رضی اللہ عنہا کا نکاح حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے ہوا اور اسی وجہ سے ان کو ذوالنورین کا خطاب ملا۔سیدہ اُم کلثوم رضی اللہ عنہا نے سن ۹ ہجری میں وفات پائی۔[2]

سیّدۃ النساء حضرت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا آنحضرت ﷺ کی سب سے چھوٹی اور پیاری بیٹی ہیں۔حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی پیدائش کے وقت آنحضرت ﷺ کی عمر ۴۱ برس کی تھی۔سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کا نکاح حضرت علی رضی اللہ عنہ سے جنگِ بدر کے بعد ہوا۔آپ رضی اللہ عنہا کی اولادیں حضرت امام حسن، امام حسین رضی اللہ عنہما، سیدہ اُم کلثوم رضی اللہ عنہا اور سیدہ زینب رضی اللہ عنہا ہیں۔

سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کی وفات سن ۱۱ ہجری میں ہوئی۔[3]

---

[1] ابن عبد البر، الاستیعاب۔ ۳۹۸/٤

[2] البیهقي، دلائل النبوة: ۲۸۳/۷، أبو نعیم الأصبهاني، معرفة الصحابة: ۲٤٥/۱

[3] ابن حجر، الإصابة: ۸۷/٤

۵۔ مُعجزاتُ النبی ﷺ

معجزہ کا مفہوم ''خرقِ عادت'' ہے۔ معجزہ انبیاء علیہم السلام کے اس فعل کو کہتے ہیں جو اس وقت دوسروں کو ویسا کرنے سے عاجز بنا دے۔[1] معجزہ کے لیے قرآن و حدیث میں آیت یعنی نشانی کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ ہمارے رسولِ مقبول حضرت محمد ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے بے شمار معجزات عطا کیے۔[2] یہاں صرف چند معجزات کا ذکر کیا جاتا ہے۔

۱۔ حُدَیبیہ میں آنحضرت ﷺ نے وضو کیا۔ پانی ایک چھاگل میں تھا۔ مسلمان اسے دیکھ کر ٹوٹ پڑے۔ نبی اکرم ﷺ نے پوچھا: کیا ہے؟ لوگوں نے عرض کیا کہ پانی نہ وضو کے لیے ہے نہ پینے کے لیے، صرف یہی چھاگل ہے جو حضور ﷺ کے سامنے ہے۔ آپ ﷺ نے اسی برتن میں ہاتھ رکھ دیا۔ بس پھر کیا تھا، آپ ﷺ کی انگلیوں سے پانی پھوٹ پڑا۔ پندرہ سو مسلمانوں نے وضو کیا اور خوب پانی پیا۔[3]

۲۔ دوسرے دن آنحضرت ﷺ حدیبیہ نامی کنویں پر تشریف لے گئے۔ کنویں کا پانی خشک ہو چکا تھا۔ نبی کریم ﷺ کنویں کی منڈیر پر بیٹھ گئے۔ پانی منگوا کر کُلّی کی اور کنویں میں ڈال دی۔ تھوڑی دیر بعد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے کنویں سے پانی لیا اور سیراب ہو گئے۔[4]

۳۔ جنگِ خندق میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے دیکھا کہ آنحضرت ﷺ نے بھوک کی وجہ سے

---

[1] الجرجاني، التعريفات، ص: ٢١٩ ، عبدالرؤوف المناوي ، التوقيف على مهمات التعاريف، ص: ٦٦٥

[2] الأنعام :٦/٣٧ ، الأعراف :٧/٧٣ ، طٰهٰ :٢٠/٢٢

[3] صحيح البخاري:٣٥٧٦، ٤١٥٢ـ ٤١٥٣، صحيح مسلم :٢٢٧٩

[4] صحيح البخاري:٣٥٧٧، ٤١٥٠ـ٤١٥١

پیٹ کو باندھ رکھا ہے۔ اُنھوں نے اپنے گھر میں جا کر بتایا۔ ان کی زوجہ محترمہ نے کھانا پکایا اور آنحضرت ﷺ کو دعوت بھیج دی۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ ۱۰۰۰ ساتھیوں کو لے کر میزبان کے مکان پر جا پہنچے۔ گھر والے گھبرا گئے لیکن اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کی وجہ سے کھانے میں اتنی برکت پیدا کر دی کہ ساری جماعت نے خوب سیر ہو کر کھانا کھایا۔[1]

۴۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ اہلِ مکہ نے نبی کریم ﷺ سے درخواست کی تھی کہ ان کو کوئی بڑا نشان دکھایا جائے۔ آپ ﷺ نے انھیں چاند کا پھٹنا دکھلایا، اس کے دو ٹکڑے تھے، کوہِ حرا دونوں ٹکڑوں کے درمیان تھا۔[2]

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰى اٰلِ مُحَمَّدٍ كَمَا صَلَّيْتَ عَلٰى اِبْرٰهِيْمَ وَ عَلٰى اٰلِ اِبْرٰهِيْمَ اِنَّكَ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ.
اَللّٰهُمَّ بَارِكْ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰى اٰلِ مُحَمَّدٍ كَمَا بَارَكْتَ عَلٰى اِبْرٰهِيْمَ وَ عَلٰى اٰلِ اِبْرٰهِيْمَ اِنَّكَ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ

---

[1] صحيح البخاري: ۳۰۷۰، ۴۱۰۱-۴۱۰۲

[2] صحيح البخاري: ۳۶۳۶-۳۶۳۷، صحيح مسلم: ۲۸۰۲

مصادر و مراجع

کتبِ تفسیر

١. الجامع لأحكام القرآن، أبو عبدالله محمد بن أحمد بن أبى بكر القرطبى، م ٦٧١ھ. مؤسسة الرسالة، بيروت١٤٢٧ھ

٢. تفسير القرآن العظيم، أبو الفداء إسماعيل بن عمر بن كثير الدمشقى، م ٧٧٤ھ. دارالكتب العلمية، بيروت١٤١٩ھ

٣. معالم التنزيل،أبو محمد الحسين بن مسعود البغوى،م ٥١٠ھ. دارالأندلس، بيروت ١٤٣١ھ

٤. المحرّر الوجيز فى تفسير الكتاب العزيز، عبدالحق بن غالب بن عطية الأندلسى، م٥٤٢ھ۔ دارالكتب العلمية، بيروت١٤٢٢ھ۔

کتبِ حدیث

٥. صحيح البخارى،أبو عبدالله محمد بن إسماعيل البخارى، م ٢٥٦ھ دارالسلام، الرياض ١٤١٩ھ

٦. صحيح مسلم، أبو الحسن مسلم بن الحجاج النيسابورى ،٢٦١ھ ، دارالسلام، الرياض ١٤٢١ھ

٧. سنن أبى داود، سليمان بن الأشعث السجستانى،م ٢٧٥ھ ، دارالسلام ، الرياض ١٤٢٠ھ

٨. سنن الترمذى،أبو عيسىٰ محمد بن عيسىٰ الترمذى،م ٢٧٩ھ . دارالسلام ، الرياض ١٤٢٠ھ

٩. سنن النسائى،أبو عبدالرحمن أحمد بن شعيب بن على النسائى، م٣٠٣ ھ.

دار السلام، الرياض ١٤٢٠ھ

١٠. سنن ابن ماجه، أبو عبدالله محمد بن يزيد القزويني، م ٢٧٣ھ . دار السلام، الرياض ١٤٢٠ھ

١١. مسند الإمام أحمد بن حنبل، أبو عبدالله أحمد بن محمد بن حنبل الشيباني، م ٢٤١ھ . مؤسسة الرسالة، بيروت ١٤٢٩ھ

١٢. الإحسان في تقريب صحيح ابن حبان، محمد بن حبان بن أحمد بن حبان التميمي،م ٣٥٤ھ.مؤسسة الرسالة، بيروت ١٤١٨ھ

١٣. المعجم الكبير،أبو القاسم سليمان بن أحمد بن أيوب الطبراني،م ٣٦٠ھ. دار الكتب العلمية، بيروت

١٤. المعجم الأوسط،أبو القاسم سليمان بن أحمد بن أيوب الطبراني، م ٣٦٠ھ. دار الكتب العلمية، بيروت ١٤٢٠ھ

١٥. شعب الإيمان،أبو بكر أحمد بن الحسين بن علي البيهقي، م ٤٥٨ھ . دار الباز، مكة المكرمة ١٤١٠ھ

١٦. مسند أبي يعلىٰ، أبو يعلىٰ أحمد بن علي بن المثنى الموصلي،م ٣٠٧ھ . دار المأمون للتراث، دمشق ١٤٣٠ھ

١٧. السنن الكبرىٰ، أبوبكر أحمد بن الحسين بن علي بن موسىٰ البيهقي، م ٤٥٨ھ دار الفكر، بيروت

١٨. مسند عائشة(رضي الله عنها)، سليمان بن الأشعث السبحستاني،م ٢٧٥ھ. مكتبة دار الاقصىٰ، الكويت ١٤٠٥ھ

١٩. مسند الحميدي، أبي بكر عبدالله بن الزبير المكي، م ٢١٩ھ.عباس أحمد الباز، مكة المكرمة ١٣٩٩ھ

٢٠. المستدرک على الصحيحين،أبو عبد الله محمد بن عبدالله الحاكم

النیسابوری،م ۴۰۵ھ دارالمعرفة، بیروت ۱۴۲۷ھ

۲۱. شرح السنة، أبومحمد الحسین بن مسعود بن محمد البغوی، م ۵۱۶ھ. المکتب الإسلامي،بیروت

۲۲. المصنف،أبوبکر عبدالرزاق بن همام بن نافع الصنعانی، م ۲۱۱ھ. المکتب الإسلامي، بیروت

۲۳. کتاب السنة، أبوبکر بن أبی عاصم الشیبانی،م۲۸۷ھ. المکتب الإسلامی، بیروت

۲۴. سنن الدار قطنی، أبو الحسن علی بن عمر الدارقطنی،م۳۸۵ھ. دارالمحاسن، المدینة المنورة ۱۹۶۰ء

۲۵. صحیح ابن خزیمة، أبو بکر محمد بن إسحاق بن خزیمة النیسابوری، م ۳۱۱ھ ،المکتب الاسلامی، بیروت ۱۹۸۹ء

۲۶. کنزالعمال فی سنن الأقوال والأفعال، علاء الدین علی بن حسام الدین الهندی، ۹۷۵ھ، مؤسسة الرسالة، بیروت ۱۳۹۹ھ

۲۷. المصنف، أبوبکر بن أبی شیبة،۲۳۵ھ إدارة القرآن والعلوم الإسلامیة، کراچی ۱۴۰۶ھ

کتب شروحات احادیث

۲۸. فتح الباری شرح صحیح البخاری، أبوالفضل أحمد بن علی بن حجر العسقلانی، ۸۵۲ھ،دارنشرالکتب الاسلامیة، لاهور ۱۴۰۱ھ

۲۹. فیض الباری، محمد انور شاه کشمیری،۱۳۵۲ھ ، عباس أحمد الباز، مکة المکرمة ۱۴۰۷ھ

۳۰. شرح صحیح مسلم، أبو زکریا محیی الدین یحییٰ بن شرف النووی،۶۷۶ھ. دارالصدیق، الریاض ۲۰۱۶ء

کتب سیرت

۳۱. السيرة النبوية، عبدالملك بن هشام بن أيوب الحميرى.م۲۱۳ھ ، مصطفٰى البابى الحلبى۱۳۷۵ھ

۳۲. السيرة النبوية، أبو الفداء إسماعيل بن عمر بن كثير الد مشقي،م۷۷۴ھ. دارأحياء التراث العربى، بيروت ۱۳۸۳ھ

۳۳. سبل الهدىٰ والرشاد فى سيرة خير العباد، محمد بن يوسف الصالحى الشامى، م۹۴۲ھ . دارالكتب العلمية، بيروت۱۴۱۴ھ

۳۴. الروض الأنف، أبو القاسم عبد الرحمٰن بن عبدالله بن أحمد السهيلى، م ۵۸۱ھ. دارالحديث،القاهرة ۱۴۲۹ھ

۳۵. دلائل النبوة، أبو نعيم أحمد بن عبد الله بن أحمد الأصبهانى، م۴۳۰ھ . المكتبة العصرية، بيروت ۱۴۳۰ھ

۳۶. نفائس الدرر من أخبار سيد البشر، مسعود بن محمد بن على جموع السجلماسى، م۱۱۱۹ھ دارابن رجب،القاهرة ۱۴۳۱ھ

۳۷. الفصول فى سيرة الرسول، أبو الفداء إسماعيل بن عمر بن كثير الدمشقى، ۷۷۴ھ .دارابن رجب، القاهرة۱۴۲۷ھ

۳۸. السيرة النبوية، محمد بن محمد أبو شهبة، م۱۴۰۳ھ، دارالقلم، دمشق ۱۴۳۰ھ

۳۹. كتاب المغازى، محمد بن عمربن واقدى،م ۲۰۷ھ . مؤسسة الأعلمى، بيروت

۴۰. حيات محمد، محمد حسين هيكل، ۱۳۷۶ھ.

۴۱. جامع الآثار، شمس الدين محمد بن عبدالله بن محمد الدمشقى، م۸۴۲ھ . دارالكتب العلمية،بيروت ۲۰۱۰ء

۴۲. كتاب النبی۔ مصطفیٰ الاعظمی
۴۳. السيرة النبوية ،الدكتور علی محمد محمد الصلابی، دارابن كثير، دمشق ۱۴۳۰ھ
۴۴. السيرة النبوية، محمد بن إسحاق بن يسار المطلبی ،م۱۵۱ھ۔ دارالكتب العلمية، بيروت ۱۴۲۴ھ
۴۵. شرف المصطفیٰ ،أبو سعد عبدالملک بن محمد بن إبراهيم الخركوشی، م۴۰۶ھ . دارالبشائر الأسلامية، مكة المكرمة ۱۴۲۴ھ
۴۶. أخلاق وآدابه، أبو محمد عبدالله بن محمد بن جعفر أبوالشيخ الأصبهانی، م۳۶۹ھ ، عالم الكتب، بيروت ۱۴۲۴ھ
۴۷. الشفا بتعريف حقوق المصطفیٰ، أبو الفضل عياض بن موسیٰ بن عياض البستی، م۵۴۴ھ، دارالفكر، بيروت
۴۸. زاد المعاد فی هدی خير العباد، محمد بن أبی بكر بن أيوب ابن قيم الجوزية، م۷۵۱ھ . مؤسسة الرسالة ، بيروت ۱۴۱۲ھ
۴۹. إمتاع الأسماع، أبو العباس أحمد بن علی بن عبدالقادر المقريزی، م۸۴۵ھ .دارالكتب العلمية، بيروت ۱۴۲۰ھ
۵۰. بنات الرسول ﷺ ، محمد أحمد عيسٰی. دارالغد الجديد، القاهرة ۱۴۲۷ھ
۵۱. غزوه حنين، محمد أحمد بن سهيل، نفيس اكيڈمی، كراچی
۵۲. كتاب أزواج النبی ﷺ، محمد بن يوسف الصالحی،م ۹۴۲ھ دارابن كثير، بيروت، ۱۴۲۴ھ
۵۳. محمد رسول الله ﷺ، محمد رضا، دارالفكر، بيروت ۱۴۲۴ھ
۵۴. الوفا بأحوال المصطفیٰ، أبوالفرج عبد الرحمن بن الجوزی،م ۵۹۷ھ المكتبة العصرية، بيروت ۱۴۳۲ھ
۵۵. عيون الأثر، محمد بن أحمد ابن سيد الناس،م ۷۳۴ھ. دارالمعرفة،بيروت

۵۶. دلائل النبوة،ابوبکر أحمد بن الحسين البيهقي ،م ۴۵۸ھ . عباس أحمد الباز، مكة المكرمة۱۴۰۵ھ

۵۷. خاتم النّبيين، محمد بن أحمد بن مصطفٰی، دارالفكر العربی، بيروت۱۳۹۴ھ

۵۸. مرويات غزوة بدر، أحمد محمد العليمي باوزير. مكتبة طيبة۱۳۹۹ھ

۵۹. الرحيق المختوم ، صفی الرحمٰن المباركفوری،م۱۴۲۷ھ. رابطة العالم الأسلامی، مكةالمكرمة،۱۴۰۰ھ

۶۰. الخصائص الكبریٰ، عبدالرحمن بن أبی بكر السيوطی،م ۹۱۱ھ. دارالكتب العلمية، بيروت

۶۱. قادة النبی ﷺ، محمود شيت خطاب، .دارالقلم، دمشق۱۴۲۰ھ

۶۲. السيرة النبوية، سعيد حویٰ، .دارالسلام، القاهرة۱۴۳۰ھ

کتب تاریخ

۶۳. تاريخ الرسل والملوک، أبو جعفر محمد بن جرير الطبری، م۳۱۰ھ . دارالتراث، بيروت،۱۳۸۷ھ

۶۴. البداية والنهاية، أبو الفداء إسماعيل بن عمر بن كثير ، الدمشقی،م ۷۷۴ھ .دار ابن كثير، دمشق۱۴۲۸ھ

۶۵. المفصل فی تاريخ العرب قبل الإسلام، الدكتور جواد علی،م۱۴۰۸ھ. مكتبة جرير۱۴۲۷ھ

۶۶. شفاء الغرام بأخبار البلدالحرام،محمد بن أحمد بن علی الفاسی،م۸۳۲ھ. النهضة الحديثة، مكة المكرمة۱۹۵۶ء

۶۷. أخبار مكة و ما جاء فيها من الآثار ، أبو الوليد محمد بن عبدالله بن أحمد الأزرقی، م۲۵۰ھ . دارالثقافة، مكة المكرمة ۱۳۹۸ھ

۶۸. تاریخ الإسلام، شمس الدین محمد بن أحمد عثمان الذهبی،م۷۴۸ھ. المکتبة التوفیقیة ،القاهرة

۶۹. تاریخ الخمیس، حسین بن محمد بن الحسن الدیاربکری،م ۹۶۶ھ. مؤسسة شعبان ، بیروت

۷۰. تلقیح فهوم أهل الأثر، عبدالرحمن بن الجوزی، م۵۹۷ھ.أحیاء السنة، پاکستان

۷۱. التاریخ الإسلامی، محمود شاکر . المکتب الإسلامی، بیروت۱۴۱۶ھ

۷۲. الکامل فی التاریخ ، محمد بن عبدالکریم الجزری،ابن الأثیر، م۶۳۰ھ . دارصادر، بیروت۱۳۸۵ھ

۷۳. المحبر، أبو جعفر محمد بن حبیب بن أمیة البغدادی، م۲۴۵ھ، دارالآفاق الجدیدة ، بیروت ۱۳۶۱ھ

۷۴. تاریخ الیعقوبی، أحمد بن أبی یعقوب بن جعفر الیعقوبی،م۲۷۸ھ ، مؤسسة الأعلمی، بیروت،۱۴۱۳ھ

۷۵. تاریخ أبی الفداء، عماد الدین أبو الفداء إسماعیل بن علی،م۷۳۲ھ. دارالکتب العلمیة، بیروت، ۱۴۰۶ھ

۷۶. المعارف، عبدالله بن مسلم بن قتیبة الدینوری، م۲۷۶ھ.أحیاء التراث العربی، بیروت،۱۳۹۰ھ

۷۷. تاریخ الخلفاء، عبدالرحمن بن أبی بکر السیوطی، م۹۱۱ھ.دارالفکر، بیروت، ۱۳۹۴ھ

۷۸. التحفة اللطیفة فی تاریخ المدینة، شمس الدین السخاوی، م۹۰۲ھ. دارالکتب العلمیة،بیروت،۱۴۱۴ھ

۷۹. تاریخ المدینة، قطب الدین الحنفی.

۸۰. مروج الذهب، أبو الحسن علی بن الحسین بن علی المسعودی، م۳۴۶ھ . دارالکتب العلمیة، بیروت، ۱۴۰۶ھ

کتب انساب

۸۱. أنساب الأشراف، أحمد بن یحییٰ بن جابرالبلاذری، م۲۷۹ھ ، دارالفکر، بیروت،۱۴۱۷ھ

کتب بلدان

۸۲. معجم البلدان، أبو عبدالله یاقوت بن عبدالله الحموی، م۶۲۶ھ . دارالکتاب العربی، بیروت

۸۳. آثارالبلاد وأخبار العباد، زکریا بن محمد بن محمود القزوینی،م ۶۸۲ھ. دارصادر ،بیروت۱۳۹۹ھ

۸۴. أوضح المسالک، محمد بن علی البروسوی،م۹۹۷ھ. دارالغرب الإسلامی، بیروت،۱۴۲۷ھ

۸۵. معجم مااستعجم، عبدالله بن عبد العزیز البکری الأندلسی،م ۴۸۷ھ .عالم الکتب، بیروت

التراجم والطبقات

۸۶. الطبقات الکبریٰ، أبو عبدالله محمد بن سعد الهاشمی، م۲۳۰ھ. دارصادر، بیروت

۸۷. الاستیعاب فی معرفة الأصحاب، عبدالله بن محمد بن عبدالبر، م۴۶۳ھ. دارالکتب العلمیة، بیروت۱۴۲۲ھ

۸۸. أسد الغابة فی معرفة الصحابة، أبو الحسن علی بن محمد بن محمد ابن الأثیر الجزری، م۶۳۰ھ، دارالمعرفة، بیروت، ۱۴۲۸ھ

۸۹. الإصابة في تمييز الصحابة، أحمد بن علی بن حجر العسقلانی، م ۸۵۲ھ دارھجر ۱۴۲۲ھ

۹۰. أخبار عمر رضی اللہ عنہ، علی الطنطاوی، المکتب الاسلامی، ۱۴۰۳ھ

۹۱. سیف اللہ خالد بن الولید رضی اللہ عنہ، اکرم الجنرال، مؤسسة الرسالة، بیروت، ۱۴۲۱ھ

۹۲. الوافی بالوفیات، خلیل بن أیبک الصفدی، م۷۶۴ھ. دارأحیاء التراث العربی، بیروت، ۱۴۲۰ھ

۹۳. الأعلام، محمد بن علی بن فارس الزرکلی، م۱۳۹۶ھ. دارالعلم للملایین، بیروت، ۱۹۸۴ء

۹۴. معرفة الصحابة، أبو نعیم أحمد بن عبداللہ الأصبهانی، م۴۳۰ھ، مکتبة الحرمین، الریاض، ۱۴۰۸ھ

۹۵. عیون الأنباء فی طبقات الأطباء، أبو العباس ابن أبی أصیبعة، م۶۶۸ھ

۹۶. تهذیب الأسماء واللغات، أبوزکریا محیی الدین یحییٰ بن شرف النووی، م۶۷۶ھ. دارالفیحاء، دمشق ۱۴۲۷ھ

ادب

۹۷. بلوغ الأرب، السید محمود شکری الآلوسی، م۱۳۴۸ھ. المکتبة العصریة، بیروت، ۱۴۳۰ھ

۹۸. صبح الأعشیٰ، أحمد بن علی القلقشندی، م۸۲۱ھ. دارالفکر، بیروت

۹۹. کتاب الأمالی، أبو علی إسماعیل بن القاسم القالی، م۳۵۶ھ، دارالکتب العلمیة، بیروت، ۱۴۲۳ھ

۱۰۰. درالصحابة، الشوکانی

کتبِ لغت

۱۰۱. لسان العرب، أبو الفضل محمد بن مکرم بن علی ابن منظور الإفریقی،

م ۷۱۱ھ. دارصادر، بیروت، ۱۳۰۰ھ

۱۰۲. کتاب التعریفات، علی بن محمد بن علی الجرجانی، م۸۱۶ھ. دارالکتب العلمیة، بیروت، ۱۴۰۳ھ

۱۰۳. التوقیف علی مهمات التعاریف، عبدالرؤف بن تاج العارفین بن علی بن زین العابدین، م ۱۰۳۱ھ

۱۰۴. القاموس المحیط، محمد بن یعقوب الفیروز آبادی، م۸۱۷ھ، دارالحدیث، القاهرة، ۱۴۲۹ھ

۱۰۵. تاج العروس من جواهر القاموس، محمد بن عبدالرزاق مرتضیٰ الزبیدی. م۱۲۰۵ھ . دارالفکر، بیروت، ۱۴۱۴ھ

متفرق کتب

۱۰۶. الموسوعة العربیة المیسرة، حسین محمد نصار ، المکتبة العصریة ، بیروت، ۱۴۳۱ھ

۱۰۷. موسوعة الأدیان، مجموعة من العلماء. دارالقاس ، بیروت

۱۰۸. موسوعة الفرق والأدیان ، إسلام محمود دربالة، مکتبة الایمان، قاهرة، ۱۴۲۸ھ

۱۰۹. اردو دائرۂ معارفِ اسلامیہ، مجلس علمی، شعبہ اردو دائرۂ معارف اسلامیہ، ۲۰۰۸ء. پنجاب یونیورسٹی، لاهور

۱۱۰. کتاب الأموال، ابو عبید القاسم بن سلام بن عبدالله البغدادی، م۲۲۴ھ. مکتبه الأثریة

۱۱۱. نسب قریش، مصعب بن عبدالله الزبیری، م۲۳۶ھ. مکتبة الحیدریة، ۱۴۲۷ھ

۱۱۲. شرح العقیدة الطحاویة، ابن أبی العزالحنفی، م۷۹۲ھ، المکتب الإسلامي، بیروت، ۱۳۹۱ھ

۱۱۳. الملل والنحل، محمد بن عبد الکریم الشهرستانی، م۵۴۸ھ . دارالمعرفة، بیروت، ۱۴۰۴ھ

اَنَا خَاتَمُ النَّبِیّٖنَ لَا نَبِیَّ بَعْدِیْ (الحدیث)

اس وحی کا آنا تھا کہ حضرت رسول اکرم ﷺ پر اپنی اُمت کی تعلیم کا بڑا بوجھ ڈال دیا گیا۔ آپ ﷺ ڈر گئے، دل کانپ گیا۔ فوراً گھر واپس آئے اور حضرت خدیجہ ؓ سے کہا کہ مجھے کمبل پہناؤ۔ انھوں نے آپ ﷺ پر کمبل ڈال دیا۔ جب ذرا سکون ہوا تو آپ ﷺ نے حضرت خدیجہ ؓ سے سارا ماجرا بیان کیا۔ حضرت خدیجہ ؓ نے آپ ﷺ کو تسلی دی اور کہا کہ: ''آپ تو صلہ رحمی کرتے ہیں۔ غریبوں محتاجوں اور بے کسوں پر رحم فرماتے ہیں۔ مسکینوں کے کام آتے ہیں اور حق معاملات میں مظلوموں کی حمایت کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو ہرگز نقصان نہیں پہنچنے دے گا۔''

پھر حضرت خدیجہ ؓ رسول اکرم ﷺ کو اپنے چچیرے بھائی ورقہ بن نوفل کے پاس لے گئیں۔ ورقہ بن نوفل بڑا عالم فاضل آدمی تھا اور تورات خوب جانتا تھا۔ اس نے سارا واقعہ سن کر کہا کہ یہ وہی فرشتہ ہے جو حضرت موسیٰ ؑ پر اترا تھا۔ پھر کہا: اے کاش! میں اس وقت طاقتور اور تندرست ہوتا جب آپ کی قوم آپ کو گھر سے نکال دے گی۔ حضرت رسول اکرم ﷺ نے پوچھا: کیا ایسا ہوگا؟ ورقہ نے کہا کہ آپ ﷺ سے پہلے جو بھی اس قسم کا پیغام لے کر آئے ان کی قوم نے ایسا ہی کیا۔

اقتباس ''سیرت رحمت عالم ﷺ'' صفحہ نمبر ۵۷

ISBN 978-969-8042-94-3
9 789698 042943